عبدالرحمن مخلص

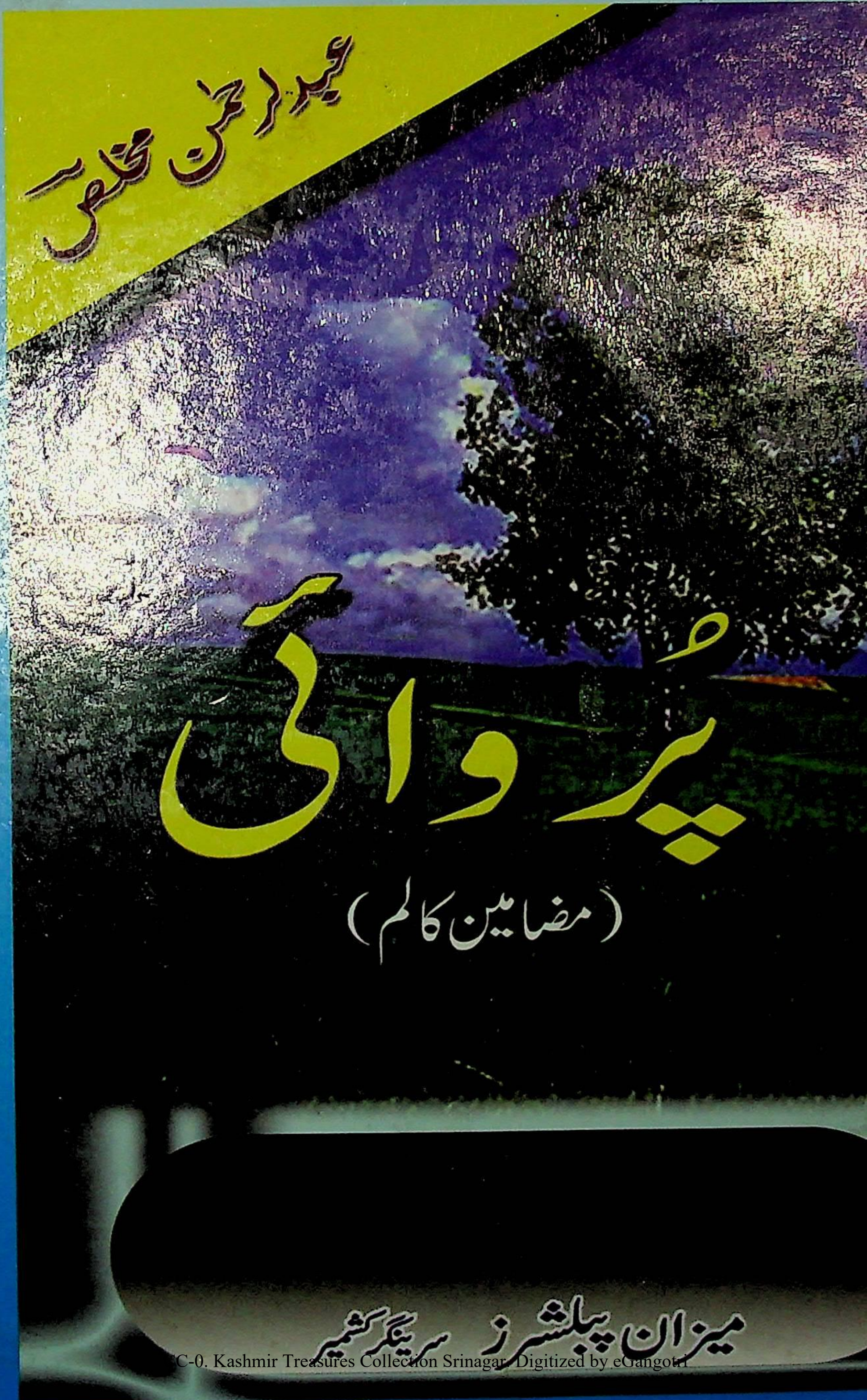

پُروائی

(مضامین کالم)

میزان پبلشرز سرینگر کشمیر

پُروائی

(کالم ”زندگی کے رنگ“ کا کتابی سلسلہ نمبر 2)

عبدالرحمان مخلص

میزان پبلشرز (رجسٹرڈ)
متصل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز ہیڈکوارٹرس
بٹہ مالو سرینگر

© جملہ حقوق محفوظ ہیں

انٹرنیشنل بک اسٹینڈرڈ نمبر
ISBN 978-93-80691-19-0

ٹائٹل : پُروائی
مصنف ومرتب : عبدالرحمٰن مخلص Cell: 9797219497
سالِ اشاعت : 2012ء
کمپوزنگ : وسیم احمد
سرورق : فیض احمد
مطبوعہ : میزان سروسز
قیمت : تین سو روپے، لائبریری ایڈیشن: چار سو روپے
تعداد : پانچ سو

ناشر

میزان پبلشرز (رجسٹرڈ)

Title : **Purwaye**
Author and Compiler : **Ab. Rehman Mukhlis**
Price : Rs 300
Publisher : **Meezan Publishers**
Opp. Fire and Emergency Services
Headquarters, Batamaloo, Srinagar
Pho: 2470851, Fax : 0194-2457215
Cell : 09419002212
E-mail:Meezanpublishers@rediffmail.com

زیر اہتمام
شبیر احمد

انتساب

اپنے والدینِ محترم کے نام جن کی پیشانی کا
پسینہ آج میرے قلم کی روشنائی بن
کر قرطاسِ ابیض کو گُل
وگلزار بنا رہا ہے۔

عبدالرحمٰن مخلصؔ

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	4
۱.	مت بھگاؤ	8
۲.	ضرب اللسان	11
۳.	آزمائش شرط ہے	14
۴.	زندگانی تماشے کی	17
۵.	کرامت	20
۶.	تہہ بر تہہ	23
۷.	زندگی انمول	26
۸.	اُلٹی منطق	29
۹.	ہدایت کی طلب	32
۱۰.	ذوقِ مطالعہ	35
۱۱.	بہت بڑی دولت	38
۱۲.	اُلٹی گنگا	42
۱۳.	ناچ سکو تو ناچو	45

۱۴.	پھول، پت جھڑ کا	48
۱۵.	اظہارِ حق	51
۱۶.	احساسِ گناہ	54
۱۷.	یا اولوالاباب والبصار	58
۱۸.	بنگلہ دیشی سوٹ	61
۱۹.	بومبرو بومبرو......	65
۲۰.	اُردو جسے کہیں......	69
۲۱.	قدموں کا ثبات	72
۲۲.	پھوُلن جلتی چِتا	75
۲۳.	تقاضے، انسانیت کے	78
۲۴.	سیکھنا سکھانا	81
۲۵.	داخلہ ممنوع نہیں	84
۲۶.	مورو پلّو لٹکے	87
۲۷.	آئینہ	90
۲۸.	بے خبر	92
۲۹.	سویرا	95
۳۰.	لہولہو زندگی	98
۳۱.	ایک مٹھی ریت	102
۳۲.	فانی/لافانی	106
۳۳.	جذبۂ چنگیزی	109

۳۴.	باعثِ تخریب	112
۳۵.	بسم اللہ کی برکت	115
۳۶.	تفاوت	118
۳۷.	ماسوائے گُل	121
۳۸.	نزاکتِ احساس	124
۳۹.	کالی دُنیا	127
۴۰.	برکتِ ابلیس	131
۴۱.	عیدِ معصوماں	134
۴۲.	دریائے زندگی	137
۴۳.	تکلاغنی	140
۴۴.	کرو یاد	144
۴۵.	اپنی جنگ	148
۴۶.	ماہِ نو	151
۴۷.	اعلان اور اخفا	154
۴۸.	غائت صلوٰۃ	157
۴۹.	باوزن	160
۵۰.	خط افلاس کے نیچے	163
۵۱.	صورتِ دیوار	166
۵۲.	یہ لٹھ باز	169
۵۳.	لاجواب	172

۵۴.	راہِ اصلاح	175
۵۵.	کمزوری	177
۵۶.	میلی چادر	180
۵۷.	روشن ہالہ	183
۵۸.	مرکز کی سازش	186
۵۹.	آل حاجی	189
۶۰.	سخت مشکل	192
۶۱.	سرنوشت	195
۶۲.	سلوتری	198
۶۳.	غم نہ داری......	201
۶۴.	قاتل دورِ جاہلیت کے	204
۶۵.	غور طلب	207
۶۶.	رِکٹرِن	210
۶۷.	شکست آرزو	213
	مشاہیر کے مکاتیب اور تبصرے	
۱.	جناب جگن ناتھ آزاد (ماہر اقبالیات)	
۲.	جناب محمد یوسف ٹینگ	
۳.	جناب محمد یوسف ٹینگ	
۴.	جناب محمد یوسف ٹینگ	
۵.	جناب محمد یوسف ٹینگ	

۶.	جناب عبدالجبار جوہر
۷.	جناب منظور انجم (ایڈیٹر روزنامہ ‘عقاب’ سرینگر)
۸.	جناب منظور انجم (ایڈیٹر روزنامہ ‘عقاب’ سرینگر)
۹.	جناب حکیم منظور (ایڈیٹر روزنامہ ‘عقاب’ سرینگر)
۱۰.	جناب ڈاکٹر بشیر احمد نحوی (ڈائریکٹر اقبال انسٹی چیوٹ)
۱۱.	جناب شہباز راجوروی
۱۲.	جناب رفیق راز (ڈائریکٹر ریڈیو کشمیر سرینگر)
۱۳.	جناب رحمان قدوس یوپی
۱۴.	جناب جی ایم شاہ (مرحوم) سابق چیف منسٹر جموں وکشمیر)
۱۵.	‘دعوت فکر’ پر تبصرہ از جناب حمید اللہ بھٹ۔ مدیر ‘اردو دنیا’ نئی دہلی
۱۶.	‘زندگی کے رنگ’ پر تبصرہ: از جناب ڈاکٹر ظفر احمد قدوائی (ماہنامہ ‘انشاء’ کلکتہ
۱۷.	مکتوب جناب نور شاہ سرینگر
۱۸.	عکس یوسف

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اللہ کا فضل و کرم ہے کہ تا دمِ تحریر میرے 1000 (ایک ہزار) سے زائد کالم، مقالے، مضامین، افسانے، انشائیے اور کتابوں پر تبصرے، ریاست، ملک اور بیرونِ ملک کے اخبارات اور رسائل و جرائد میں شائع ہو کر عوام و خواص سے خاصی داد پا چکے ہیں۔ اخبارات اور رسائل و جرائد میں رونامہ ‘‘خدمت’’، سرینگر، روزنامہ ‘‘آفتاب’’ سرینگر؛ روزنامہ ‘‘عقاب’’ سرینگر ہفت روزہ ‘‘احتساب’’ سرینگر ہفت روزہ ‘‘خبر و نظر’’ سرینگر؛ روزنامہ ‘‘کشمیر عظمیٰ’’ سرینگر؛ ہفت روزہ ‘‘شہاب’’، اننت ناگ؛ ماہنامہ ‘‘پرواز’’ لدھیانہ (پنجاب)؛ انٹرنیشنل اُردو ماہنامہ ‘‘انشاء’’ کلکتہ؛ ماہنامہ ‘‘مستانہ جوگی’’ نئی دہلی؛ ماہنامہ ‘‘نوید سحر’’ جاپان اور ماہنامہ ‘‘سمندر’’ جرمنی قابل ذکر ہیں۔ 116 (ایک سو سولہ) کالموں پر مشتمل کتاب ‘‘دعوتِ فکر’’ اور 115 (ایک سو پندرہ) مزید کالموں پر مشتمل کتاب ‘‘زندگی کے رنگ’’ کی عام قارئین۔ کے علاوہ ملک کے مقتدر شعراء، ادباء اور نقادوں نے بڑی سراہنا کی ہے، جس سے مجھے کافی حوصلہ ملا۔ ایک ناول، ایک تعلیمی تالیف و تصنیف، دو تنقیدی نوعیت کی کتابیں اس پر مستزاد ہیں۔ (تنقیدی نوعیت کی کتاب ‘‘سُر شہنائی کے’’ جناب رفیق راز کے ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ یافتہ کشمیری شعری مجموعے ‘‘نَے چھے نالاں’’ کا مطالعاتی جائزہ ہے اور اہل علم سے داد پا چکا ہے۔ دو کتابیں ‘‘سخن ہائے گفتنی’’ اور ‘‘نگاہِ بازگشت’’ زیر ترتیب و طبع ہیں...... ‘‘سخن ہائے گفتنی’’

میرے تنقیدی و تحقیقی مضامین اور تبصروں کا مجموعہ ہے اور سب مضامین ''اقبال انسٹی ٹیوٹ'' یونیورسٹی آف کشمیر کی شائع کردہ کتاب'' وہ دانائے سبل ختم الرسلؐ......''، ''انشاء'' کلکتہ......اور جموں و کشمیر اکادمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کے جریدے ''شیرازہ'' (اردو) اور ''کشمیر عظمیٰ'' وغیرہ میں پہلے ہی شائع ہو چکے ہیں ''نگاہِ بازگشت'' مشہور ادیب، افسانہ نگار و ناول نگار نور شاہ کی کتاب ''بند کمرے کی کھڑکی'' کا مطالعاتی جائزہ ہے اور ہفت روزہ ''احتساب'' سرینگر میں قسط وار شائع ہو چکا ہے۔)

اب اللہ کے فضل و کرم اور قارئین و ناقدین کی پسندیدگی کے مظاہرے کے زیرِ نظر 67 (مع چند افسانوں کے) کالموں کا مجموعہ ''پُروائی'' کے نام سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ ان کالموں کی تحریر و اشاعت میں بھی میری وہی تمنا مضمر ہے جس کا اظہار میں ''دعوتِ فکر'' اور ''زندگی کے رنگ'' کے ''پیش لفظ'' میں کر چکا ہوں۔

کتاب شائع کرنا دورِ حاضر میں کارِ فرہاد سے کم مشکل نہیں کیونکہ لوگوں میں یا تو ذوقِ مطالعہ ہے ہی نہیں یا اگر ہے تو نہ ہونے کے برابر۔ اس وجہ سے، ظاہر ہے، پڑھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گننے کے قابل ہوگی۔ ہاں! لوگ کتاب پڑھیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ بالکل مفت ملے۔ لیکن ایسی حالت میں بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ مفت ملنے کے باوجود کتاب کو پڑھیں گے ہی۔ اِدھر حقیقت یہ ہے کہ مواد اگر صرف اخبارات و رسائل میں چھپے اور کتابی شکل و صورت نہ پائے تو مصنف کی محنت بڑی حد تک اکارت جانے کا احتمال رہتا ہے۔ اب ملک بھر میں ایسے ادارے ضرور پائے جاتے ہیں جن کے ذمہ اچھی کتابوں کی خریداری کا فرض تھا لیکن بدقسمتی سے اُن اداروں میں حسب روایت اثر رسوخ، نام و نمود اور اقرباء پروری کا بول بالا ہے۔ جب مصنف یا شاعر کی محنت کی پذیرائی نہ

ہوتو وہ دل برداشتہ ہو کے قلم توڑ کر من ہی من میں آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں عموماً اور کشمیر میں خصوصاً اعلیٰ ادب تخلیق نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو کسی بَن پھول کی طرح دیدہ ودل کے بوسے پائے بِنا مُرجھا کر پیوند خاک ہو جاتا ہے۔ بقول فریاد آذر ؎

توڑنے والا جب ملا نہ کوئی
رہ گئے پھول کتنے مرجھا کر

میں اپنی کتابیں لے کر کبھی بھی کسی ادارے میں ہاتھ پھیلانے نہیں گیا لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بہت ہی اچھے شاعر اور ادیب اپنی اپنی کتابیں بغل میں دبائے سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں بیوروکریٹس کی جھڑکیاں کھا کر بڑے بے آبرو ہو کر نکلتے ہیں۔ یعنی غالبؔ کی زبان میں ؎

نکلنا خُلد سے آدمؑ کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

حالانکہ یہی ادارے علم ودانش کے بنیادی مراکز ہیں، جب انہی اداروں میں شعراء وادباء کی پذیرائی اور آبیاری نہ ہو، تو علم وادب کا پودا کسی بھی حال میں پنپ نہیں سکتا۔ آج ملاوٹ شدہ چوکر کا بیس کلو والا تھیلا تین سو روپے میں ملتا ہے جسے ایک گائے یا گھوڑا زیادہ سے زیادہ تین دن میں چٹ کر جاتا ہے لیکن 400 (چار سو) صفحات پر مشتمل خونِ جگر سے رقم شدہ کتاب کوئی دس روپے میں بھی خریدنے کا روادار نہیں۔ کتاب تو کتاب، اکثر لوگ دو روپے میں ملنے والا اخبار بھی مانگ کر پڑھتے ہیں اور پڑھ کر ایک لمبی جماہی لینے کے بعد یا تو سو جاتے ہیں یا وقت کو ٹھٹھولیوں میں گنوا کر مست اور مگن رہتے ہیں۔ اکثر لوگوں میں ذوقِ مطالعہ پیدا ہو جائے تو ہمارے دیس کی سرزمین اعلیٰ ادب کے لئے بڑی ہی زرخیز ہے۔

میں نے اس کتاب (پُروائی) کے آخر میں ''آئینہ نما'' عنوان کے تحت چند

مشاہیر کے خطوط ، تبصرے اور خیالات درج کئے ہیں۔ ان سے میری غرض خودنمائی اور خودستائی نہیں بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کتاب پڑھنے سے پہلے ان کا مطالعہ فرمائیں اور یہ باور کرلیں کہ پڑھنے ۔ سے آپ کا وقت ضائع نہیں ہوگا۔ نیز آپ اس بات کو بھی جان لیں کہ تقریباً تمام حضرات کا نقطۂ نظر میری تحریروں کے سلسلے میں یکساں ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ:

Great men think alike.

میری اللہ سے دعا ہے کہ میرے یہ شذرات اس کی بارگاہِ بے نیاز میں مقبول ہوں اور بنی نوع انسان کے لئے کسی نہ کسی صورت میں باعثِ فلاح ثابت ہوں آمین!...... یہ شذرات میرا اثاثہ ہیں۔ اس اثاثے کے سلسلے میں مجھ بندۂ گنہگار کو اقبالؒ اور مولانا رومیؒ کے یہ دو اشعار بے حد پسند ہیں کیونکہ ان کے ڈانڈے میرے تصورات سے ملتے ہیں۔

ہے یہی میری نماز ، ہے یہی مرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

(اقبالؒ)

بہ خدا خبر ندارم چوں نماز می گزارم
کہ تمام شُد رکوعے کہ امام شد فلانے

(رومیؔ)

میں ''میزان پبلشرز'' کا شکریہ ادا کرنا انتہائی ضروری خیال کرتا ہوں کیونکہ یہ ادارہ اشاعت کی دُنیا میں ایک اہم نام و مقام حاصل کر چکا ہے اور اس کی وساطت سے متعدد معیاری کتابیں شائع ہو کر اُردو دنیا کو مالا مال کر چکی ہیں۔

عبدالرحمان مخلص سیر جاگیر سوپور (کشمیر)۔

Cell:9797219497, Email:armukhlis1@yahoo.com

امت بھگاؤ

کبھی بیدار نہ ہونے سے کبھی نہ کبھی بیدار ہونا بہر حال بہتر ہے کیونکہ جہاں آنکھ کھلے وہیں سویرا ہوتا ہے۔ ہزاروں مثالیں شاہد ہیں کہ کچھ لوگوں کی آنکھ بدیر ہی سہی لیکن کھلی اور وہ زندوں میں شامل ہو گئے اور بے شمار ایسے بھی ہیں جنہوں نے کبھی آنکھ کھولنا ہی نہیں چاہی یہاں تک کہ مُردوں میں درج ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ آنکھ والوں کی دنیا میں نہیں، اندھوں کی دنیا میں اندھیرا رہتا ہے۔

ایک صاحب اِس وقت ستّر کے پیٹے میں ہیں۔ عالی دماغ، دانشور، شاعر، ادیب، مفکر، اعلیٰ تعلیم یافتہ...... کثرتِ مطالعہ سے اُن کی قابلیت اور واقفیت حیران کن حد تک وسیع ہے۔ اُن سے بات کر کے یا بحث ومباحثہ کے وقت انسان اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس ہمہ صفت موصوف شخص کی میری نظروں میں

بس ایک خامی ہے کہ وہ مذہب بیزار ہیں۔ اس کے لئے، ممکن ہے، اُس کے پاس کوئی جواز ہو لیکن میں اُس شخص سے محبت نہیں رکھتا جو اسلامی نام رکھنے کے باوجود خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کے متوازی چلے۔ ہاں کسی کا نام مائیکل شولوخوف یا چنگ پاؤ پنگ ہو تو بات دوسری ہے۔

گزشتہ جمعتہ المبارک کو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے اُسے ایک مسجد میں نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ میں دل ہی دل میں کہنے لگا: ''میاں جی! اب آ گئے نا راستے پر! اب آپ کو بس ایک مٹھی داڑھی پالنے کی ضرورت ہے اور آپ مسلمانِ صادق کہلائیں گے۔ بہت سے نخریلے لوگ عمر بھر فریبِ زندگی کھا کر اللہ کی بارگاہ سے بھاگے پھرتے ہیں اور فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے گریزاں رہتے ہیں لیکن جب بڑھاپے کے ناتواں ہاتھ اُن کی گردن مروڑ لیتے ہیں اور حالات کا بھنور اُن کو نگلنے لگتا ہے تو اللہ کی بارگاہ کے سوا انہیں اور کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی۔ اگرچہ اُس وقت بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے لیکن اللہ کی رحمت سے کسی کو بخشنا کبھی بعید نہیں ہوتا۔ خیر دیر آید درست آید اور پھر اگر صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اُسے بھولا نہیں کہا جا سکتا!!

وہ اُس کے دو ایک روز بعد ملے تو میں نے بہ آواز بلند مبارکباد دی۔ وہ بولے ''بھئی! مبارکباد کس خوشی میں؟!''

میں نے جواب میں کہا ''جناب مبارکباد اس بات پر کہ آخر آپ گھر لوٹ ہی آئے! زندگی میں پہلی بار آپ کو نماز پڑھتے دیکھ کر یقیناً قلبی مسرت حاصل ہوئی!''

اُس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا کہ ''ارے بھئی پہلی نماز پر ہی تو مجھ پر پہلی پھٹکار پڑی۔ اب کبھی مسجد میں جانے سے میری توبہ، میرے باپ کی توبہ، میرے دادا پردادا کی توبہ!'' مجھے حیرت اور افسوس کے جھٹکے سے سنبھلنے میں چند

لمحے لگے اور پھر پوچھا:

''اس بیزاری کی وجہ؟!''

''ارے بھئی وہاں تو لوگ ایک دوسرے کو آنکھیں اور کہنیاں مارتے ہوئے ٹھٹھولیاں کر رہے تھے اور وہ کندۂ ناتراش امام عالمِ غیض وغضب میں اول جلول بک رہا تھا۔ جان کا خوف لاحق نہ ہوتا تو میں اس کا سرِ مبارک خطبے کے عصا سے دو نیم کر دیتا۔ میاں! تم لوگ تو کہتے ہو کہ مسجد اللہ کا گھر ہے اور اللہ بہت بڑا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو تم لوگ مسجد میں سر کے بل جانے کے بجائے دندناتے ہوئے کیوں جاتے ہو اور تمہارا امام اُس جگہ اول فول کیوں بکتا ہے جہاں ایستادہ ہو کر تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمام دنیا کو اخلاص وانسانیت کا درس دیا تھا؟''

میں دم بخود رہ گیا کیونکہ میرے پاس اُس نکتہ رس مسلمان مُلحد کو مطمئن کرنے کے لئے الفاظ نہیں تھے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے وجود کے اندر کہیں پر کوئی نازک سی چیز ٹوٹ گئی اور اس سے جو صدا بلند ہوئی وہ احتجاج کر رہی تھی:

''اے مسلمانو، اے مسلمانوں کے امامو!! اگر تم میں یہ صلاحیت نہیں کہ کسی گریزاں شخص کو مسجد کی طرف کھینچ سکو لیکن کم سے کم مسجد سے بھگاؤ تو مت۔ خدا کے لئے!!''

* * *

۲.ضرب اللسان

گھاؤ کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک گھاؤ وہ ہوتا ہے جس میں انسانی جسم کا کوئی حصہ کسی تیز دھار والی شئے سے کٹ جاتا ہے۔ اُس سے خون بہتا ہے۔ اُس کی مرہم پٹی کی جاتی ہے اور وہ ایک مدتِ مقررہ میں مندمل ہو کے اپنے پیچھے ایک نشان چھوڑ جاتا ہے اور بس! اُس پر نظر پڑتی ہے تو انسان کو یاد آتا ہے کہ وہ کبھی زخمی ہوا تھا۔ لیکن یہ تصور قطعی دیرپا نہیں ہوتا...... ایک گھاؤ وہ ہوتا ہے کہ جسم کا کوئی حصہ کسی ٹھوس چیز کی زد میں آتا ہے اور ایک کالا نیلا نشان اُبھرتا ہے جس کے درد کی شدت بڑی دلگداز اور جاں سوز ہوتی ہے۔ یہ کالا نیلا دھبہ بھی ایک خاص مدت میں رفتہ رفتہ زائل ہو جاتا ہے اور پیچھے کوئی نشان نہیں چھوڑ جاتا، چھوڑے بھی تو محبوب کے رُخسار پر اُبھرے ہوئے کالے تِل کی طرح دلربا لگتا ہے وغیرہ......

بڑ

لیکن ان سب سے ایذا رساں اور جانگداز وہ گھاؤ ہوتا ہے جو کسی کی زبان سے لگتا ہے۔ اس میں اگر چہ نہ ہی زخم ہوتا ہے، نہ خون بہتا ہے، نہ درد ہوتا ہے اور نہ نشان کا اتہ پتہ ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ روح کی گہرائیوں کو چھید کر کہیں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈیرہ ڈال دیتا ہے۔ اسی لئے عربی زبان میں کہا گیا ہے کہ ''ضرب اللسان اشد من ضرب السنان''۔ (زبان کی ضرب نیزے کی ضرب سے زیادہ شدید ہوتی ہے)۔

جمع کا صیغہ

ایک صاحب بڑے ہی سیدھے سادے اور بھولے بھالے تھے۔ اس پر ستم یہ کہ اَن پڑھ بھی تھے۔ کسی کام سے پہلی بار ریاست سے باہر گئے۔ واپسی ٹرین سے ہوئی۔ اثناء سفر میں جب ٹرین ایک چھوٹے سٹیشن پر رکی تو وہ کسی حاجت سے نیچے اُترے۔ ابھی حاجت پوری نہیں ہوئی تھی کہ ٹرین چھک چھک کرتی ہوئی چلدی۔ وہ بہتیرے چلاّئے لیکن ٹرین آج تک اس طرح کبھی کسی کیلئے رکی ہے؟! ہائے ہائے کرتے ہوئے وہ لوگوں سے کشمیری زبان میں اپنی بپتا کہتے رہے لیکن سبھی لوگ زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم کے مصداق اس کا بس منہ تکتے رہے۔ کسی نے پوچھا: ''بھائی جانا کہاں ہے!؟'' تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ (بیچاری اُردو زبان کا یہی تو قصور ہے کہ یہ خواہ مخواہ اوروں کی سمجھ میں آتی ہے اور لاکھ ناواقفیت کے باوجود ہر شخص اس کے چند الفاظ بول ہی لیتا ہے)۔ اُس نے اپنی اُردو دانی کا یوں ثبوت دیا:۔

واحد کا صیغہ

''بھائی ورمُل گڑھتا ہے!'' (بھائی مجھے بارہمولہ جانا ہے)

اجنبی دیس کے اجنبی راستوں پر وہ کئی دن تک اسی ناقابل فہم جملے کا ورد کرتا رہا اور دھکے کھاتا رہا۔ قسمت کا دھنی تھا کہ پھر بھی گھر پہنچ گیا۔ اُس کے اس حادثے کا مدتوں گھر گھر اور گلی گلی چرچا رہا اور وہ ہدفِ تمسخر بن گیا۔

ایک دن میں اپنے ایک رفیق کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ بس سٹاپ پر ایک

صاحب ملے اور اُس نے میرے رفیق کے ساتھ علیک سلیک کی۔ میرے رفیق نے مجھ سے پوچھا: ''آپ انہیں جانتے ہیں؟''

''نہیں!'' میں نے جواب دیا

''یہ وہی ورمُل گرشھتاہے، والے صاحب ہیں!!''

میں نے دیکھ لیا کہ یہ سن کر اس کے چہرے پر سخت حالتِ انقباض طاری ہوگئی اور وہ پتھر کا ہوگیا۔ کئی لمحوں کے بعد اس کے چہرے کی نسیں رفتہ رفتہ ڈھیلی پڑ گئیں۔ پتھریلے ہونٹ وا ہوئے اور کسی پربت کے پیچھے سے بولے:

جمع کا صیغ

''میاں! تمہارے نسب میں ضرور کوئی کھوٹ ہونا چاہئے۔ تمہاری زبان نے آج اُس زخم کو کرید لیا جو میرے خیال میں مندمل ہو چکا تھا۔ آج کی اِس ضرب کے بعد یہ شاید ہی بھر سکے۔ جا خدا تم سے سمجھے!!''

پھر وہ چل دیا لیکن اس کی آنکھوں کے بھیگے ہوئے گوشے شدتِ ضرب کی چغلی کھا رہے تھے!!

* * *

۳۔ آزمائش شرط ہے

گھنے جنگلوں کے اندر ایک خاردار زہریلی جھاڑی ہوتی ہے جسے ''بچھو بوٹی'' کہا جاتا ہے۔ اس بوٹی کا کانٹا لگنے سے پہلے چبھن ہوتی ہے، پھر جلن اور سوجن۔ رفتہ رفتہ زہر پھیلنے لگتا ہے جو بسا اوقات جان لیوا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس کا ایک تریاق ہے...... پالک کا پتا...... کسی کو کانٹا لگے تو وہ پالک کا پتا اس پر مَل کر درد اور زہر سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔ قدرت کے حیرت انگیز نظام کے تحت جہاں بچھو بوٹی اُگتی ہے، وہاں لازمی طور پر آگے پیچھے یا اغل بغل میں پالک کا پودا بھی پایا جاتا ہے۔ یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ بچھو بوٹی موجود ہو اور پالک کا پودا مفقود ہو۔ اس سے یہ اشاریہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس صفحۂ ہستی پر انسان کے ہر درد کا درمان اُس کی رسائی کے اندر موجود ہے۔ اسی اشاریہ کی مزید تصدیق اِس امر سے

ہو جاتی ہے کہ اللہ جل شانہ' نے پہلے زمین بنائی، اس کے اندر سامانِ زیست رکھا اور اُس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اُتارا۔ آج کی جدید دنیا میں انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والی لاکھوں کروڑوں ضروریات میں سے ایک بھی چیز اِس زمین سے ماوراء نہیں ہے۔

انسان کو لاحق ہونے والی جسمانی بیماریوں میں فی الوقت کینسر اور ایڈز دو ایسی بیماریاں ہیں جن کا کوئی علاج نہیں۔ اس لئے یہ بیماریاں بنی نوع انسان کے لئے ایک خوابِ وحشت (Night Mare) بن گئی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں ان بیماریوں سے بھی زیادہ وحشت ناک ایک اور بیماری ہے جسے سیدھے سادے الفاظ میں ''اخلاقی بیماری'' کہا جاسکتا ہے۔ کینسر اور ایڈز اپنی تمام تر ہولناکیوں کے باوجود اپنے اندر ''محدودیت'' کا پہلو رکھتی ہیں لیکن اخلاقی بیماری کی پہنچ اور اثر لامحدود ہے۔ یہ ایک وقت میں فقط ایک فرد کو متاثر نہیں کرتی بلکہ پورے گلوب کے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اس فنا بدوش بیماری کو قابو میں کرنے کے لئے دورِ حاضر میں اَن گنت دوائیاں آزمائی جارہی ہیں لیکن بیماری ہے کہ بڑھتی اور پھیلتی ہی جارہی ہے۔ اس لئے انسان اب مایوس ہو چلا ہے اور تسلیم کر بیٹھا ہے کہ یہ بیماری لاعلاج ہے۔ اگر یہ خیال ٹھیک ہے تو اس کا راست مطلب یہ ہے کہ یہاں قدرت نے اپنے اصول بدل لئے ہیں اور بچھو بوٹی کے ساتھ پالک کا پتا نہیں اُگایا ہے لیکن قدرت کے اصول لگے بندھے اور نپے تُلے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں کسی بھی رخنے کو تلاش کرنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن بھی۔ اگر آپ خدانخواستہ کسی قسم کی بھی اخلاقی بیماری میں مبتلا ہیں اور پوری سنجیدگی سے چاہتے ہیں کہ اس کا علاج ہو تو قرآن شریف کھولئے۔ اسے چاہے بوسہ دیجئے یا نہیں، آنکھوں سے لگایئے یا نہیں، لیکن سورۂ فاتحہ سے سورۂ ناس تک بس ایک بار غور و فکر کی عینک لگا کر، سمجھ سمجھ کر، ٹھہر ٹھہر کر جرعہ جرعہ پی لیجے۔

(نہار منہہ پی لیں تو کیا کہنے) اس کے بعد بھی اگر آپ کی اخلاقی بیماری دور نہ ہو جائے تو مجھے ایک بیرنگ خط کے ذریعے مطلع کیجئے۔ میں یقینی طور سے بذریعہ منی آرڈر آپ کو اُس وقت کی قیمت ادا کردوں گا جو آپ نے قرآن شریف کے مطالعہ میں صرف کیا ہو۔ آزمائش شرط ہے!!

* * *

۴. زندگانی تماشے کی

کوئی معقول انسان اس بات کو غیر شعوری طور پر بھی نہیں جھٹلا سکتا کہ آج ہماری ریاست کا بیشتر حصہ جہنم بنا ہوا ہے۔ آگ، خون، بارود، دھماکے، ہاؤ ہُو، آہ و بکا، چیخ و پکار، یاس و حسرت، خوف و دہشت، جبر و قہر ہماری زندگی کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ جہاں یہ ہو، وہاں کی زندگی کو سب کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن زندگی نہیں کہا جا سکتا۔ کوئی کہے تو وہ صریحاً الزام ہوگا۔ زندگی تو ایک بہت ہی بھلی اور پیاری سی چیز ہے جو کئی ناگوار کیفیات کے باوجود خوشگوار ہوتی ہے۔ اسے کوئی جہاں بھر کے مال و دولت کے عوض بھی لٹانے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ یہی زندگی جب الزام اور انسان کے لئے بارِ دوش بن جائے تو اس کے تعلق سے سنجیدہ غور و فکر کرنے کی اشد ضرورت ہے لیکن یہاں عملاً ایسا نہیں ہے۔ ہر شخص زیادہ سے زیادہ اخبار، ریڈیو،

ٹی۔ وی سے حالات کی پرچھائیاں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور فرصت کے اوقات میں (جس کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔) ان پر گرما گرم بحث کرتا ہے اور اپنے نقطہ نظر کو دوسروں پر ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے۔

کیا یہ معقولیت اور حقیقت پسندی ہے کہ کسی کے گھر میں آگ لگی ہو اور وہ برلبِ دریا گھڑا لے کر اُسے چھلّے سے بجاتا ہوا رُسلؔ میر کی غزل سُر تال کا خیال رکھتے ہوئے گا رہا ہو اور یہ فرض کئے بیٹھا ہو کہ لوگ باگ آ کر اس کے گھر کی آگ کو بجھا دیں ؟! نہیں ، یہ حقیقت پسندی اور معقولیت نہیں ہے ! حقیقت پسندی اور معقولیت یہ ہے کہ وہ دریا سے گھڑے میں پانی لے لے کر آگ کے شعلوں پر اُلٹ دے اور ساتھ ہی ''مدد مدد'' بھی پکارے۔ اس طرزِ عمل سے گھر کے بچ جانے کے امکانات قابل لحاظ حد تک بڑھ سکتے ہیں۔ آج کشمیر کے جلنے کا منظر ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ اگر کوئی نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ خود کشمیری ہے۔ اگر وہ دیکھ رہا ہوتا تو کاہچرائی کے رقبہ جات پر ناجائز تجاوزات نہ ہوتے ، مالِ حرام کی کمائی سے فلک بوس عمارتیں کھڑی نہ ہوتیں ، دوکاندار گاہک کی شہ رگ پر ڈریکیولا کی طرح دانت گاڑھ کر اس کا خون شیر مادر کی طرح نہ پیتا ، ملازم رشوت کو اپنا پیدائشی حق مان کر اس کے ریٹ لسٹ مشتہر نہ کرتا ، انجینئر اور ٹھیکیدار کا بنایا ہوا پُل ''رسم افتاح'' کے ساتھ ہی آدم زادوں کو لے کر دریا میں بیٹھ نہ جاتا ، ڈاکٹر ہسپتال کو بلائے جان اور اپنے پرائیوٹ کلینک کو دارالامان تصور نہ کرتا ، سڑک چھاپ عاشق بہو بیٹیوں پر آوازے نہ کستے ، جوان بزرگوں کی پگڑیاں نہ اُچھالتے ، بیٹی گھر سے بھاگ کر خاندان کی ناک نہ کاٹتی ، بیٹا کسی بیٹی کو بھگاے جا کر ملک کی روایتی عزت و ناموس کی عصمت دری نہ کرتا ، ٹمبر سمگلر ملک کے سبز سونے کا ناس نہ کرتا ، وردی والا اس کی سرپرستی نہ کرتا ، بھائی بھائی سے اور دوست دوست سے خائف نہیں رہتا ، علماء قوم کے درد کا درماں تلاش کرنے کے بجائے فتوے بیچنے کا کاروبار نہ کرتے ، مبلغین

احساسِ خفتہ کو تازیانۂ عبرت مارنے کے بجائے لوگوں کو برگِ حشیش مصری میں گھول کے نہ پلاتے، سیاست دان قوم کی بقاء کے بجائے اپنی گدّیوں کی بقاء کی فکر نہ کرتے، اساتذہ کرام سرکاری سکولوں میں اپنی ڈیوٹی سے عدم دلچسپی کا اظہار کر کے پرائیویٹ سکولوں اور کوچنگ سنٹروں کی حوصلہ افزائی نہ کرتے اور شاہین بچوں کو خاکبازی کا درس نہ دیتے۔ وغیرہ وغیرہ۔

افسوس یہ سب ہو رہا ہے اور خوب دھڑلے سے ہو رہا ہے۔ کیا اس کا مطلب واضح ترین الفاظ میں یہ نہیں کہ ہمیں وطن کی آبادی اور بچاؤ کے بجائے اپنے ذاتی اغراض و مفادات پیارے ہے؟! میری تمنا ہے کہ یہ جلتا ہوا گلشن بچے کس طرح بچے، یہ یہاں کے ہر متنفس کے۔ لئے ترجیحی بنیادوں پر سوچنے کا سوال ہے۔ وگرنہ ہم بے وقوفوں کی طرح گاتے رہیں گے۔

آگ لگی ہمری جھونپڑیا میں ہم گاویں ملہار
دیکھ بھائی کیسی تماشے کی زندگانی ہمار

* * *

۵. کرامت

ہر چند کہ دورِ جدید میں مرد و عورت کے فرائض و حقوق میں ’’مساوات‘‘ کا بہت شور و غوغا ہے لیکن اس کے باوجود زندگی کے جوئے کا تین چوتھائی دباؤ مرد کی گردن پر ہی رہتا ہے۔ اس دباؤ کے نتیجے میں مرد مختلف النوع مسائل سے دوچار رہتا ہے اور خانگی معاملات میں ہمیشہ ایک متوازن طرزِ عمل کا اظہار نہیں کر پاتا۔ چنانچہ جب اسکے غیر متوازن طرزِ عمل کا جواب عورت کی طرف سے بھی غیر متوازن ہی ملتا ہے تو گھریلو خلفشار اور انتشار جنم لیتا ہے جو کبھی کبھی بربادی پر منتج ہوتا ہے اور جہاں انتشار حد سے گزر جائے وہاں ببول اور زقوم کے درخت اُگتے ہیں۔ قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق اس قسم کے خاردار اور ناگوار درخت جہنم میں بھی پائے جاتے ہیں۔

زندگی ایک نظر میں ”روٹی، کپڑا، مکان“ میں مقید اور محدود چیز لگتی ہے۔ اچھا کھاؤ، اچھا پہنو اور اچھی بود باش اختیار کرو۔ اللہ اللہ خیر سلاّ۔ لیکن میں نے اُن لوگوں کی زندگیوں میں بھی ناقابلِ برداشت ناآسودگی دیکھی ہے جن کو یہ تینوں آسودگیاں وافر مقدار میں میسر ہیں اور ناواقف لوگ انہیں رشک وحسد سے دیکھتے ہیں۔ مرد بھی اگرچہ الزامات سے کلی طور پر بری الذمہ نہیں ہوسکتا، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ناآسودگی کی ابتداء اکثر معاملات میں عورت ہی سے ہوتی ہے۔ (کوئی جورو کا غلام جان کے خوف سے اس کا اعتراف نہ کرے تو دوسری بات ہے۔) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عورت کی طرف سے یہ شروعات بالعمد اور بالقصد اکثر نہیں ہوتی۔ اس کے لئے اُس کی نفسیاتی اور جسمانی مجبوریاں ذمہ دار ہوتی ہیں۔

مجھے کسی عورت کے فیلڈ مارشل، ائر مارشل، امیر البحر یا خلاباز بننے میں بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن دعویٰ ہے کہ یہ سب بن کر بھی وہ اپنی نفسیاتی اور جسمانی مجبوریوں سے دامن نہیں چھڑا سکتی کیونکہ انسان سب کچھ کرسکتا ہے لیکن فطرت کے اصولوں کو نہیں بدل سکتا۔ یہ اصول ناقابل تسخیر ہوتے ہیں، اس لئے ان کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہی دانشمندی اور بہتر زندگی کی ضمانت ہے۔ فطرت ہی نے عورت میں چند کمزوریوں کے ساتھ چند توانائیاں بھی رکھی ہیں جن میں سب سے بڑی توانائی اُس کا صبر وضبط ہے۔ یہ بھی میرا دعویٰ ہے کہ مرد کو دانتوں پسینہ بھی آئے لیکن وہ عورت کے صبر وضبط کی گرد بھی نہیں پاسکتا۔ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر دیکھ لیجئے کہ گھر میں ماس مچھلی پکی ہے۔ سوندھی سوندھی اشتہا انگیز خوشبو کے بھپکے اُٹھ رہے ہیں۔ پیر و جوان سب بے تابی سے کھانا پروسے جانے کا انتظار کررہے ہیں۔ بچے اُدھم مچا رہے ہیں لیکن ایک ہستی یعنی گرہستن اس سب سے بے نیاز بس پکوانوں کو لذیذ سے لذیز تر بنانے کی فکر میں ہے۔ بس بہ امر مجبوری نمک مرچ کے اعتدال کو جانچنے کے لئے شوربے کی دو ایک بوندیں چکھ لیتی ہے۔

اللہ آمین سے کھانا پروستی ہے تو سب کے کھا چکنے کے بعد بچا کچھا کھا لیتی ہے (اور بعض اوقات یہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔) سیر ہو کے اپنے گھر اور اہل وعیال کے حق میں لمبی چوڑی دعائیں مانگتی ہے اور کام میں جٹ جاتی ہے۔ پیٹ کی اُکساہٹوں کے سامنے بڑے بڑے زیر ہو جاتے ہیں لیکن عورت ان اکساہٹوں کو رام کر لیتی ہے......اگر یہ اپنی زبان کی اُکساہٹوں کو رام کرنے میں بھی کامیاب ہو جائے تو اُسی دن ایک نئی جنت کی تعمیر کا سنگِ بنیاد پڑے گا۔

حکایت ہے کہ ایک مرد جب تھک ہار کر گھر لوٹتا تو نامساعد و ناموافق حالات کی آندھی اُس کے دماغ میں اُتھل پتھل مچاتی رہتی۔ اسی اتھل پتھل کے دوران میں اس کا طرزِ عمل غیر متوازن ہو جاتا اور وہ ناحق چڑ جاتا۔ پھر وہ ایک بات کہتا تو اس کی عورت دو باتوں سے جواب دیتی۔ بات بڑھ جاتی اور ایک : دو کا تناسب ختم ہو جاتا ہے اور مرد عورت کو پیٹ ڈالتا۔ جب یہ وطیرۂ عمل دراز ہو گیا تو عورت تعویذ گنڈے کیلئے ایک سیانے کے پاس گئی۔ سیانے نے اُس کی رام کہانی سنی اور معقول ہدیہ لے کر ایک تعویذِ شریف اُس کے سپرد کرتے ہوئے کہا: ”دیکھو بی! یہ کوئی معمولی تعویذ شریف نہیں ہے۔ یہ چیزیں بس اپنے قدر دانوں کو ہی مرحمت کرتا ہوں۔ اس کی قدر کرو گی اور میری بتائی ہوئی ترکیب استعمال پر کاربند رہو گی تو چند ہی دنوں میں خاوند تمہارا زرخرید غلام بن جائے گا۔ دیکھو! جوں ہی تمہیں لگے کہ جھگڑا ہونے والا ہے، اس تعویذ شریف کو خاوند کی نظریں بچا کر اپنے دانتوں تلے دبانا، جتنا زور سے دبائے رکھو گی، اتنا ہی تمہارے لئے بہتر ہے!“۔

......عورت نے ایسا ہی کیا تو پھر کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ وہ پیر بابا کی معتقد ہو گئی۔ اب اسے یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ یہ سب تعویذِ شریف کی نہیں بلکہ منہ بند رکھنے کی کرامت تھی!!

⁂

٦. تہہ بر تہہ

ایک بزرگ شخص جاڑوں میں اپنا طبّی معائینہ کرانے کے لئے ڈاکٹر کے پاس گئے ۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے کپڑے اُتارنے کے لئے کہا۔ بزرگ نے پہلے اپنا کنٹوپ اُتار کر بیڈ پر رکھا اور ایک ایک کر کے کپڑے اتارنا شروع کئے۔ ڈبل اُونی چادر (جوڑہ پٔٹ)، پٹو کا پھیران (معہ پوژھ)، اونی کوٹ، اونی صدری، پورے بازؤں والی بنیان، بازوؤں کے بغیر بنیان، اونی قمیص، نسبتاً باریک قمیص، سوتی قمیص اور پھر انڈر شرٹ۔ پیاز کے چھلکے اُتارنے کے اس عمل کے دوران میں ڈاکٹر صاحب اسے تکتے رہے اور دی اینڈ (The End) کے بعد حیرت سے بولے: ”اتنے سارے کپڑے؟!“

”جناب! میں نے آپ کی سہولت کیلئے آدھے سے زیادہ کپڑے گھر پر

رکھے ہیں!“

بزرگ نے معصومیت سے کہا اور ڈاکٹر صاحب قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گئے۔

اتنے سارے کپڑے پہننا بزرگ مذکور کے لئے مجبوری تھی کیونکہ جاڑوں کی سردی اُس کی بزرگی پر مستزاد تھی لیکن وہ پھر بھی ڈاکٹر صاحب کے لئے ہنسنے کا سامان بن گئے۔ لیکن کیا کیجئے کہ یہاں اب اکثر لوگ خواہ مخواہ دوسروں کے لئے سامانِ تفریح بن جاتے ہیں۔ محض فارورڈ (Forward) کہلانے کے شوق میں!...... آج کل یہاں سیمنٹڈ (Cemented) رہائشی مکان تعمیر کرنا فیشن بن گیا ہے حالانکہ ان مکانات کا ہمارے جغرافیائی محل وقوع کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ...... جہاں پالا پڑتا ہو، برف گرتی ہو، پانی اور زمین یخ بستہ ہوتی ہو اور آلۂ حرارت پیما کا مرکری منفی تیس ڈگری سیلشس تک سمٹ جاتا ہو اور سامانِ حرارت اکثر مفقود ہو، وہاں اس قسم کے مکان تعمیر کرنا صرف جنون ہو سکتا ہے۔ لیکن جنون میں بھی چونکہ اپنی طرز کا طرہ ہوتا ہے، اس لئے لوگ بے تحاشا سیمنٹڈ مکان تعمیر کرتے چلے جا رہے ہیں اور ڈاکٹروں کے گھر آباد اور اپنے جوڑ بند برباد کرتے ہیں۔

چند سال پہلے ایک کڑاکے کے جاڑے میں جب ایک سیمنٹڈ مالکِ مکان کی قلفی جمنے لگی تو اس نے اپنے بیڈروم کی تزئین کچھ اس طرح سے کی...... فرش پر خالص کشمیری گھاس کی چٹائی (پیچ)، اس کے اُوپر دریجیٹ، اس کے اوپر دری، اس کے اوپر مسند، اس کے اوپر گبہ، اس کے اوپر نمدہ، اس کے اوپر میٹرس، میٹرس کے اوپر میٹرس، اس کے اوپر کمبل، اس کے اوپر بیڈ شیٹ، اس کے اوپر آدمی، آدمی کے اوپر لحاف، لحاف کے اوپر لحاف، لحاف کے اُوپر کمبل، کمبل کے اوپر کمبل، کمبل کے اوپر پھیرن...... پھر بھی دانت تھے کہ کٹ کٹ بج رہے تھے اور صرف اسی کٹکٹاہٹ کی آواز سے اس کے وجود کو بیڈروم میں تلاش کیا جا سکتا تھا ورنہ بادی

النظر میں وہ بیڈروم کسی کباڑی کی دوکان لگ رہا تھا جس میں بہت ساری اوڑھنے بچھونے کی چیزیں تہہ بر تہہ رکھی ہوئی تھیں۔

''پوشکھ تینے ژولکھ تینا'' (اگر مقابلہ نہ کر سکے تو بھاگے کیوں نہیں؟!) کے مصداق اُس صاحب نے اپنے برادرِ اکبر سے جاڑے کے لئے پناہ (Refuge) طلب کی جو ابھی اُس جیسے ماڈرن نہیں بنے تھے اور جس کے ساتھ اس کی کٹی چل رہی تھی۔ برادرِ اکبر نے پناہ تو دی لیکن اتنا زور زور سے ہنسے کہ ہنستے ہنستے اس کی پسلیاں درد کرنے لگیں۔ ہنسی کے تیر برادرِ اصغر کے دل وجگر میں ترازو ہو گئے اور اس نے مسجد کے گرم حمام میں ٹھہرنا اُس کے گھر میں ٹھہرنے سے بہتر خیال کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ قدم باہر نکال کر نہ اِدھر کے رہتے اور نہ اُدھر کے، اُس نے سوچا کہ مسجد کا حمام تو ایک طرح کی دولت مشترکہ ہے اس لئے وہ اپنی بیوی اور تین کمسن بچوں کے وبال کے ساتھ اس میں کہاں سما سکتا ہے؟! ناچار اُس نے اپنی غیرت کو ایک میٹھی سی لوری سنائی اور برادرِ اکبر کے ہی گھر میں گزارہ کر لیا لیکن یہ قسم کھائی کہ بہار آنے پر وہ یا تو اپنے سیمنٹڈ مکان کو ڈس مینٹل (Dismantle) کر کے پرانی طرز کا مکان تعمیر کرے گا یا کم سے کم اس مکان سے الگ ایک مناسب خوابگاہ تعمیر کرے گا......لیکن بہار کا کیا بھروسہ!؟ ہوسکتا ہے کہ آئے ہی نہیں اور آئے بھی تو راستے میں کوئی قائد یا واعظ اغوا کر کے اپنے گھر لے جائے کیونکہ آج یہاں اغواکاری کا موسم سال میں گیارہ مہینے رہتا ہے۔

* * *

۷. زندگی انمول

''ایک انیس سالہ جوان نے، جو کہ آرمی کے بریگیڈیر کا بیٹا تھا اور آرمی سکول میں بارہویں جماعت میں پڑھتا تھا، اپنے آپ کو جمعہ کے روز گھر پر بعداز دوپہر باپ کے لائسنس یافتہ پستول سے گولی مار کر ہلاک کر دیا ......''۔ (نام روردا چندرا ولد بریگیڈیئر پشکر چندرا)

خودکشی کا نوٹ: ''زندگی بڑی ناگوار اور سخت بن گئی ہے۔''

(ہندوستان ٹائمز، اتوار 19 ستمبر 1999ء)

"A 19 year old youth,son of an Army Brigadier and a class XII student of Army school, shot himself dead at his....... residence, on Friday afternoon with his father's licensed revolver."
(Name Rudra Chandra S/o: Brig. Pushkar Chandra.)
(Sucide note:- Life has become tough!")
(The Hindustan Times on Sunday, Sept. 19,1999)

بظاہر یہ ایک معمولی بات لگتی ہے کہ ایک ٹین ایجر (Teen-ager) نے کسی وقتی جذبے کے دباؤ میں آکر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا کیونکہ اس عمر میں جذبات کے ریلے زیادہ ہی شدید اور وحشی ہوتے ہیں لیکن اگر اس طرح سوچا جائے کہ زندگی کیا اتنی سستی ہے کہ اسے جذبوں کی بھینٹ چڑھایا جائے تو بات غیر معمولی بن جاتی ہے۔ فوج کا بریگیڈیئر کوئی چھوٹا عہدیدار نہیں ہوتا اور جو بڑا عہدیدار ہوتا ہے اس کے اوصاف بھی بڑے ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے جس کے اوصاف بڑے ہوں اُس کا خانگی ماحول بھی اتنا چھوٹا اور تنگ نہیں ہوسکتا کہ لاڈلے خودکشی کرتے پھریں۔ لیکن لاڈلا پھر بھی خودکشی کرتا ہے۔ اس لئے اس سے جو واحد نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے وہ یہی ہے کہ لاڈلے نے زندگی کی اہمیت کو نہیں سمجھا تھا۔ زندگی کی اہمیت کو سمجھانے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہ نظامِ قدرت کے تحت خود بخود سمجھ میں آتی ہے۔ اب یہ بات الگ ہے کہ کوئی اسے نہ سمجھنے کی قسم کھائے بیٹھا ہو۔

آئے دن میڈیا اور دوسرے ذرائع سے خودکشی کی اتنی خبریں آتی رہتی ہیں کہ لوگ اب اس کو معمول کا عمل تصور کر کے نظر انداز کرنے لگے ہیں۔ کہیں کبھی بات چل پڑتی ہے تو لوگ اسے ٹینشن کا شاخسانہ کہہ کر ہوا میں اُڑاتے ہیں۔ بے شک ٹینشن ایک بہت ہی زبردست نفسیاتی لاحقہ ہے جو انسان کو انتہائی اقدام اٹھانے پر مجبور کرسکتا ہے لیکن یہ انتہائی اقدام لازمی طور پر خودکشی ہی کیوں!؟ اب جو انتہائی اقدام کو لازمی طور پر خودکشی پر ہی منتج کرتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ زندگی کی اہمیت سے واقف نہیں۔

زندگی انسان کے پاس اللہ کی امانت ہے۔ اس امانت کے دوران میں انسان کو اپنے حصے کا وہ فرض نبھانا ہے جس کیلئے ربِ کائنات نے اس صفحۂ ہستی پر بھیج دیا ہے۔ اللہ روئے زمین کے تمام کام تن تنہا چلا سکتا تھا کیونکہ جب وہ اس

کے بنانے پر قادر تھا تو اسے چلانا اس کے لئے کوئی مشکل عمل تو نہیں۔ لیکن اس نے انسان کو اپنے خلیفہ کے طور میں زمین پر مامور کر دیا۔ اس لئے خلیفہ کیلئے لازمی ہیں کہ وہ ان تمام توقعات پر پورا اترے جو قادر مطلق نے اس سے وابستہ کر رکھی ہے۔ وہ توقعات، جن کو ہم فرائض کا نام بھی دے سکتے ہیں، کسی کے لئے بھی کوئی معمہ نہیں ہیں بلکہ واضح اور روشن ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے لوگ ان کی طرف توجہ دینے کے بجائے زندگی کی معمولی چھیڑ خانیوں سے گھبرا کر اپنا خاتمہ کر ڈالتے ہیں حالانکہ موت نہ تو مسائل کا حل ہے اور نہ ہی زندگی کا آخری پڑاوَ کیونکہ مر کر انسان کو اپنے اعمال کی جوابدہی کے لئے پھر خدا کے حضور کھڑا ہونا ہے۔ اپنی جان کے ساتھ کھلواڑ کرنے والے سے اس کے لئے ضرور پوچھ گچھ ہوگی جو وبال بالائے وبال ہے۔

مَتو وُچھ تہ ژھوچہ نظرہ اَتھ زندگانی
چھے اکھ زیوٹھ ویوہار یدوَے چھے فانی

(مرغوب بانہالی)

(ترجمہ: اس مدھ بھری زندگی کو معمولی نظر سے مت دیکھ۔ یہ ایک بہت ہی لمبا لیکن خوشگوار تجربہ ہے، اگرچہ فانی ہے۔)

⁂

۸. اُلٹی منطق

مشہور قول ہے: ''ہر چہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند''۔ (جو کچھ تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کرو۔) لیکن اکثر اس طرح سے نہیں ہوتا۔ ''صاحب'' خود دفتر دیر سے آئیں گے اور اپنے ماتحتوں کے لئے وقت پر آنا لازمی قرار دیں گے۔ ماسٹر جی خود سگریٹ تمباکو پیئیں گے لیکن بچّوں کو اس کی مضرت اور ایذا رسانی سے آگاہ کرتے پھریں گے۔ خانہ دار خود جوا کھیلیں گے لیکن اہل و عیال کے تاش کے پتوں کو چھونے پر سیخ پا ہو جائیں گے۔ نتیجہ پوشیدہ نہیں۔ اس قسم کے وطیرۂ عمل میں دراصل یہی سفلی جذبہ کارفرما ہے کہ وہ تو اپنی من چاہی زندگی گزاریں گے لیکن دوسرے اصولوں کے شکنجے میں قید رہیں۔ اس طرح سے اُن کے جذبے کو غیر شعوری تسکین ملتی ہے۔

چونسٹھ سال کی عمر کے ایک صاحب ہیں ۔ سرکاری نوکر تو نہیں ہیں ، بس ایک پرائیوٹ کام کرتے ہیں ۔ ماشاء اللہ ! صحت اچھی خاصی ہے ، اس لئے صبح تڑکے سائیکل پر سوار ہو جاتے ہیں اور اُدھ پکے راستوں پر اُسے دوڑاتے ہوئے کوئی پندرہ کلومیٹر دور ایک قصبے میں جا کر دن بھر کام کرتے ہیں اور رات گئے واپس لوٹتے ہیں ۔ اگر اسلام ''جنم پُنر جنم'' کو مانتا تو میں کہہ سکتا تھا کہ اس کی سائیکل اپنے پچھلے جنم میں کوئی ''ذیلدار'' یا ''سزاوُل'' رہی ہو گی جس نے اعمالِ بد کا خمیازہ بھگتنے کے لئے شخص مذکور کی سائیکل کے روپ میں جنم لیا ہے ۔ وہ سائیکل کم سے کم چالیس سال پرانی ہے ۔ رنگ و روغن ندارد ، بیل (Bell) غائب ، سیٹ (کاٹھی) ادھڑی اور بیٹھی ہوئی ، مڈگارڈ کسی بزرگ کے مصنوعی دانتوں کی طرح کھڑ کھڑ بجتے ہوئے ، پیڈل نابود اور ان کی جگہ بس دو گھسے ہوئے ایکسل اوپر نیچے کی طرف اشاہ کرتے ہوئے ! اُردو زبان و ادب کا کوئی طالب علم اسے دیکھے گا تو قسم کھا کے کہے گا کہ ''جناب ! یہ تو عین غین وہی سائیکل ہے جو نامور طنز و مزاح نگار پطرس بخاری نے کسی دوست سے اونے پونے داموں خریدی تھی اور اس سے دق ہو کر پُل کے اوپر سے دریا میں پھینکی تھی !'' ۔

ان صاحب کا ایک ہمسایہ ہے جو خیر سے سرکاری ملازم ہے ۔ ریٹائر ہونے کے لئے ان کی الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے ۔ وہ بے چارے کئی سال سے آس لگائے بیٹھے تھے کہ شاید سرکار ریٹائرمنٹ کی حد اٹھاون سے بڑھا کر ساٹھ سال کر دے لیکن جب وزیرِ اعلیٰ نے یہ حد گھٹا کر پچپن سال کرنے کی بات کی تو ان کے پسینے چھوٹ گئے ۔ پہلے وہ نو بجے ڈیوٹی کے لئے روانہ ہوتے تھے ، اب لیکن اب آٹھ ہی بجے روانہ ہونا شروع ہوئے کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑیں ۔ حسنِ اتفاق سے اول الذکر صاحب ایک روز انہیں راستے میں ملے تو انہوں نے استفسار کیا :

''تم کب ریٹائر ہو رہے ہو ! ؟''

''ابھی ایک ڈیڑھ سال باقی ہے!''

''ہاں تمہیں اب ریٹائر ہونا ہی چاہئے۔ آخر عمر کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں لیکن میاں! بُرا نہ ماننا۔ میری اس میں اپنی کوئی غرض نہیں ہے۔ بس صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم ریٹائر ہو کر اب گھر پر خوب آرام کرلو۔ خدا کے فضل سے کمایا اب بہت کافی۔ اب بس تمہیں آرام کی ضرورت ہے!'' یہ کہہ کر وہ ایک جھٹکے سے پطرس بخاری والی سائیکل پر سوار ہوئے۔ اس نے اگرچہ بہت احتجاج کیا لیکن وہ اوپر نیچے کی طرف اشارہ کرنے والے پیڈل ایکسلوں کو اپنے وزن دار پاؤں سے گھماتے ہوئے بطرف قصبۂ مذکور روانہ ہوئے! ثانی الذکر صاحب انہیں دیدے پھاڑ پھاڑ کے دیکھتے رہے اور یہ نہ کہہ سکے:

''جناب عالی! آپ کی عمر شریف تو چونسٹھ سال ہے اور میں ابھی صرف ستاون کے پیٹے میں ہوں۔ جب آپ اپنے لئے آرام کرنے کا خیال دل میں نہیں رکھتے تو مجھ غریب کو گھر پر بٹھانے پر کیوں ٹلے ہوئے ہیں!؟''

* * *

۹. ہدایت کی طلب

کل روزِ جمعہ تھا۔ میں مختلف فاصلوں سے کم سے کم چھ مساجد کے لاوَڈ سپیکروں سے واعظین کرام کے ”وعظ“ سن سکتا تھا۔ میں اکثر یہ سوچتا رہتا ہوں کہ واعظ و تبلیغ کی اس کثرت کے باوجود مسلمان کردار کے اعتبار سے روز بروز کمزور کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟! میں چونکہ غور و فکر کو پسند کرتا ہوں اس لئے میرا یہ سوچنا کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کچھ ایسی ہی بات ایک عمر رسیدہ، سیدھی سادی اور اَن پڑھ عورت نے بھی مجھ سے اس طرح کہی: ”دیکھو! اتنا وعظ ہو رہا ہے لیکن یہ جاتا کس ”غیبتستان“ میں ہے کہ مسلمان ویسے کا ویسا ہے اور چکنا گھڑا بنا ہوا ہے!“ بات بھی اُسی عورت کی طرح سیدھی سادی لگتی ہے، مگر ہے بڑی تہہ دار۔

واعظین کرام کے ''وعظ'' اور مبلغین محترم کی ''تبلیغ'' بے اثر کیوں ہے؟

اس سلسلے میں اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ وعظ و تبلیغ کرنے والوں کا کردار خود مثالی نہیں ہے، اس لئے ان کے مواعظ بے اثر ہیں۔ اِس دلیل کو اُس دلیل سے مضبوط بنایا جاتا ہے کہ کسی عورت نے ایک دُور دراز مقام سے ایک بزرگ کی خدمت میں اپنا بچہ لایا اور عرض کیا: ''یا حضرت! یہ بچہ شکر بہت کھاتا ہے۔ اسے نصیحت فرمائیے!'' بزرگ نے اسے دوسرے دن آنے کے لئے کہا۔ دوسرے دن وہ عورت پھر حاضر خدمت ہوئی تو بزرگ موصوف نے بچے سے بس اتنا فرمایا: ''دیکھو بیٹا! شکر زیادہ نہیں کھانا چاہئے'' اس کے بعد عورت سے جانے کے لئے کہا۔ عورت نے حیرانی سے عرض کیا ''یا حضرت! بس اتنی سی بات کے لئے آپ نے آج دوسرے دن مجھ سے ایک لمبی مسافت طے کروائی۔ یہی بات آپ اس بچے سے کل بھی فرما سکتے تھے!'' اس پر بزرگ نے فرمایا ''بے شک میں کل بھی یہ بات کہہ سکتا تھا لیکن وہ مؤثر نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ کل میں نے خود شکر کھائی تھی۔ آج میں نے شکر نہیں کھائی ، اس لئے میری نصیحت کا اثر ضرور ہوگا!'' یہ دلیل بہت ہی پیاری اور وزن دار ہے لیکن اسی دلیل کو اور اسی قسم کی دوسری دلیلوں کو بگاڑ کا جواز بنا لینا درست نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر واعظ خود زبردست پاکیزہ اسلامی کردار کا مالک ہو تو اس کے وعظ میں ایک اعتماد اور یقین ہوگا۔ جب اعتماد اور یقین کی بنیاد پر کوئی بات کہی جائے تو اس کا زود اثر ہونا بعید از قیاس و امکان نہیں۔

لیکن حق یہ ہے کہ ہم خود ہی اصلاح کے طالب نہیں ہیں۔ جب بھی کوئی انسان کسی چیز کا حقیقی طالب بن جاتا ہے تو وہ اسے یقینی طور سے مل جاتی ہے۔ ''جویندہ یابندہ باشد'' (جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے۔) لیکن اگر دل ہی طالبِ اصلاح و ہدایت نہ ہو تو باتیں ہزار طرح کی بنائی جاسکتی ہیں ع

دل ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

ہم اکثر محفلوں اور مجلسوں میں بیٹھ کر اپنے اسلاف کے کارنامے آن، بان اور شان سے بیان کرتے ہیں اور اِتراتے پھرتے ہیں۔ ہمارے اسلاف کے کردار اور کارناموں کو ہماری تصدیق کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا کردار اور کارنامے خود اپنی تصدیق ہیں۔ اسلام کے بدترین مخالف بھی اس بات کے قائل ہیں کہ ان کا کردار مثالی تھا۔ ہمیں اگر سوچنا ہے تو بس یہ کہ ''ہم کیا ہیں؟'' ہم بہت زیادہ دیر تک دوسروں کو اپنے اسلاف کے پاکیزہ کردار کی داستانیں سنا کر مرعوب نہیں کر سکتے! یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ اللہ جل شانہٗ ہدایت کے طلبگاروں کو ضرور ہدایت عطا فرماتے ہیں۔ جب کوئی طلبگار ہی نہ ہو تو یہ بات بھی اُن کی سنت کے خلاف ہے کہ وہ ان کی تلاش میں لباسِ مجاز پہن کر بذاتِ خود نکلیں۔ بقول شاعر؂

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی چاہنے والا ہی نہیں

* * *

۱۰۔ ذوقِ مطالعہ

اچھی کتاب انسان کی بہترین رفیق ہے۔ یہ اُس وقت بھی ساتھ دیتی ہے جب کوئی بھی ساتھ دینے پر آمادہ و تیار نہ ہو اور طرہ یہ کہ رفیقوں دوستوں کی طرح درازیٔ صحبت سے اُکتا بھی نہیں جاتی۔ ہاں انسان کو تھک ہار کر خود ہی اونگھ لگ جائے تو اس میں کتاب کا کوئی قصور نہیں۔ لیکن اس بے لوث اور بے غرض رفاقت کے حصول کے لئے ایک شرط ہے کہ انسان میں ذوقِ مطالعہ ہو۔ یہ نہ ہو تو مارے باندھے کا مطالعہ لطف نہیں دیتا۔ بدقسمتی سے یہ شئے ہمارے یہاں نایاب تو نہیں لیکن کمیاب ضرور ہے۔ اکثر و بیشتر لوگ مطالعہ کو تضیع اوقات کا نام دیتے ہیں کیونکہ اس سے نقد کی صورت میں کچھ نہیں ملتا۔

کسی لانگ روٹ (Long Route) پر گاڑی میں سفر کرتے ہوئے

آپ کو بھی یہ تجربہ ضرور ہوا ہوگا کہ ذوق مطالعہ یا بوریت کا مارا کوئی مسافر اخبار یا رسالہ خریدتا ہے۔ خریداری کے اس عمل کے ساتھ ہی گاڑی میں سوار بہت سارے تعلیم یافتہ یا نیم تعلیم یافتہ لوگوں کی نظریں اُس پر جم جاتی ہیں۔ وہ بے قراری سے پہلو بدلنے لگتے ہیں کہ کب وہ صاحب اخبار رسالے کو تہہ کرنے کی کوشش کرے اور وہ ہاتھ بڑھا کر اسے اُچک لیں۔ کبھی کبھی تو کوئی اتنا جری اور دیدہ دلیر بن جاتا ہے کہ اخبار/ رسالہ ہی ہاتھ سے چھین لیتا ہے۔ اگر صاحبِ اخبار/ رسالہ مروّت کا مارا ہوا تو بس ایک ٹھنڈی آہ بھر کے رہ جاتا ہے اور اصولوں کا دھنی ہوا تو تلخ کلامی پر اُتر آتا ہے اور ناحق کی چخ چخ شروع ہو جاتی ہے۔ اب کوئی اخبار/ رسالے کے سوالی سے کہتا ''جناب! آج کل کلاس فورتھ ملازم بھی کم سے کم دس ہزار روپے کا مشاہرہ پاتا ہے۔ اگر آپ ہر روز بھی غریب ومظلوم اُردو زبان کا صرف ایک اخبار پڑھیں گے تو آپ کے بجٹ کی صحت پر ذرّہ برابر بھی اثر نہیں پڑے گا۔ ہاں اردو اخبار کی سرکولیشن (Circulation) بڑھ جائے گی۔ اخبار ترقی کرے گا۔ آپ کی اور آپ کے بچوں کی قابلیت میں اضافہ ہوگا۔ اُردو زبان بچ جائے گی جس میں ہمارے دین، تہذیب، تمدن اور شعروادب کا بیش بہا سرمایہ موجود ہے اور جو محض تعصب وتنگ نظری سے سیاست کی صلیب پر لٹکائی گئی ہے ...... چلئے مان لیا کہ اردو اخبار والے آپ کو ایک طرح سے بلیک میل کر رہے ہیں اور مواد کی جگہ اشتہارات فراہم کرتے ہیں جو کسی بھی اخبار کا حتمی مقصد نہیں ہونا چاہئے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر ان ''بے چاروں'' کو ''اشتہارات'' کی بیساکھیاں میسر نہ ہوں تو آپ کا ذوقِ مطالعہ ان کے سامان کتابت وطباعت کو بس دو دن میں کباڑی کے ہاں نیلام کروائے گا۔ کشمیری ہماری مادری زبان ہے لیکن آج تک اس کا ایک بھی اخبار یا رسالہ دس قدم سے زیادہ نہ چل سکا اور یہ بھی صرف آپ ہی کے ذوقِ مطالعہ کی کرم فرمائی ہے۔ یہ بھی مان لیا کہ آج کے زمانے میں بچت

کرنے کے سوا انسان شاید زندہ ہی نہ رہ سکے۔ لیکن بچت سگریٹ پینے میں کمی کرنے سے، ہوٹلوں ریستورانوں میں کانتی کباب میں کٹوتی کرنے سے یا سامانِ تعیش (Luxuries) میں اعتدال پیدا کرنے سے بھی کی جاسکتی ہے۔ اس لئے بچت کرنے کا آغاز اخبار، رسالہ یا کتاب نہ خریدنے سے ہی کیوں کیا جائے“؟ لیکن وہ یہ سب سن کر اخبار/رسالہ اُس کے منہ پر دے مار کر دعوتِ مبارزہ دے گا۔

ہمارے کشمیر کی سرزمین علم وادب کے معاملے میں بڑی زرخیز ہے لیکن ذوقِ مطالعہ کی کمی نے یکتائے روزگار شاعروں اور ادیبوں کو زندہ درگور کردیا۔ وہ اپنے احساسات کو نکاس عطا کرنے کے لئے لکھتے رہے اور دیدہ ودل سے چراغاں کرتے رہے لیکن اُن کے کارنامے کسمپرسی کی وجہ سے دیمک اور چوہوں کی نذر ہوگئے۔

توڑنے والا جب ملا نہ کوئی　　رہ گئے پھول کتنے مرجھا کر

یہ ذوقِ مطالعہ ہی کا فقدان ہے کہ شہکار تحریریں منصۂ شہود پر نہیں آرہی ہیں اور جو کچھ بھی سامنے آرہا ہے اس میں قلمکاروں کی ذاتی جگرکاوی، جدوجہد، کشمکش، تگ ودَو اور خانہ براندازی شامل ہوتی ہے لیکن اس کے باوصف اُنہیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ وہ کتابیں تو چھاپیں گے لیکن اُن کی قدر اور پذیرائی اُسی طرح ہوگی جس طرح اندھوں کے شہر میں آئینوں کی ہوتی ہے...... رہے وہ ادارے جو حکومتوں نے اس غرض سے بنائے تھے، تو ان کے جملہ حقوق بحقِ منظورانِ نظر اور مسکا باز خواتین وحضرات محفوظ ہیں...... ایک دنیا جانتی ہے کہ مسکا لگانا بہت بڑا فن ہے جس کے ماہروں کی تعداد ساری ریاست جموں وکشمیر میں یقیناً تین ہندسوں میں نہیں ہوگی!

⁂

۱۱. بہت بڑی دولت

پیسہ اگرچہ سب کچھ نہیں لیکن بہت کچھ ضرور ہے۔ اسلام پیسے کے حصول اد رصرف کے سلسلے میں دوسری باتوں کی طرح اعتدال کی وکالت کرتا ہے۔ یعنی انسان اس کے حصول کے لئے اپنے آپ کو اتنا زیر بار بھی نہ کر لے کہ وہ کولہو کا بیل بن کر دن رات اس مرکز کے گرد آنکھیں بند کر کے گھومتا رہے اور صَرف میں حد سے نہ گزر جائے کہ سب کچھ دو ہی پانچ دن میں لُٹا کے ٹھن ٹھن گوپال کہلائے۔

1971ء میں سرینگر سے کوئی بھی ہوائی سروس لیہہ یا کرگل (لداخ) کے لئے نہیں جاتی تھی۔ سرینگر لیہہ شاہراہ چونکہ نومبر سے جون تک درّۂ زوجیلا پر بھاری برف باری کی وجہ سے بند ہو جایا کرتی تھی اس لئے ضرورت مند لوگ چنڈی گڑھ (پنجاب) سے فوجی ہوائی جہاز کے ذریعہ لیہہ جاتا کرتے تھے۔ میں بھی

ضرورت مند تھا اور 21 فروری 1971ء کو لیہہ جانے کی غرض سے چنڈی گڑھ روانہ ہوا اور 23 فروری کو وہاں پہنچ کر ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں قیام کیا۔ صبح تڑکے ایک ٹیمپو (Tempo) لے کر ائر پورٹ پہنچا۔ وہاں میری ہی طرح اور بھی مسافر جمع تھے۔ میں دس بجے تک جہاز کی روانگی کا انتظار کرتا رہا پھر ائر پورٹ عملے نے اعلان کیا کہ موسم کی خرابی کیوجہ سے جہاز اُڑان نہیں بھر سکتا۔ میں ہوٹل لوٹ آیا پھر ائر پورٹ جانے اور وہاں سے بے نیل ومرام لوٹ آنے کا سلسلہ 27 فروری تک جاری رہا۔

27 تاریخ کو صبح دس بجے جہاز نے اُڑان بھر لی۔ میرے بائیں طرف ایک صاحب بیٹھے تھے۔ صورت سے تعلیم یافتہ ملازم لگ رہے تھے۔ میری طرف دیکھ کر انتہائی لجاجت سے بولے: ”جناب! کیا آپ مہربانی کر کے مجھے 100 روپے دے سکتے ہیں؟ جہاز کے لیہہ ائر پورٹ پر لینڈ کرتے ہی واپس کر دوں گا!“ مجھے اُن کی دماغی صحت پر شبہ ہونے لگا کہ ”یہ صاحب مجھ سے 100 روپے لے کر کیا کریں گے؟“ میں نے پوچھا ”جناب! سو روپے تو میں ضرور دوں گا لیکن آپ فضاؤں میں تیرتے ہوئے اس کا کیا کریں گے؟“...... ”اِدھر دل کے پاس جیب میں رکھوں گا تاکہ بے اعتدال دھڑکن معتدل ہو جائے“۔ اس نے جواب دیا تو میرا شک اور بڑھ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور پوچھتا، اُس نے درد بھرے لہجے میں کہا ”جناب اگر آپ سو روپے دے سکتے ہیں تو دے دیجئے وگرنہ آپ کو بھی شاید میرے زندہ نہ رہنے پر افسوس ہوگا!!“

اس کے لہجے میں کچھ ایسی دل گرفتگی تھی کہ میں نے آہستہ سے سو روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ اُس نے جھپٹ کر نوٹ لے لیا اور اسے انتہائی احتیاط کے ساتھ دل کے پاس والی جیب میں رکھ لیا۔ پھر آسودگی کا ایک لمبا سانس لے کر کہنے لگا ”جناب! بات دراصل یہ ہے......!“ وہ ابھی اپنی بات شروع ہی کر رہا

تھا کہ سٹیوارڈ نے ہمارے سروں پر آکسیجن ماسک منڈھ دیئے اور ہمارے منہ بند ہو گئے۔

گیارہ بج کر پانچ منٹ پر ہوائی جہاز نے لیہہ ائرپورٹ کے رَن وے کو چھولیا اور کچھ دیر کے بعد ہمارے قدم زمین پر تھے۔ موصوف نے فوراً سو کا نوٹ نکال کر مجھے واپس کیا اور اپنی رام کہانی یوں بیان کرنے لگا.........."جناب! میں کچھ خانہ برانداز قسم کا آدمی واقع ہوا ہوں۔ میں 15 فروری کو چندی گڑھ پہنچا اور ایک بہت ہی مہنگے ہوٹل میں قیام کیا۔ میرا خیال تھا کہ 19 تاریخ کو جہاز کی روانگی ہوگی اور میں لیہہ پہنچ کر اپنی ٹھاٹ کی زندگی حسب معمول گزارنا شروع کروں گا۔ میں افسری کے زعم میں مبتلا ایک کی جگہ دس خرچ کرنے لگا۔ میرے پاس خاصی موٹی رقم تھی لیکن میں نے اسے چندی گڑھ جیسے مہنگے شہر میں اس دھوکے میں پھونک ڈالا کہ مطلع آج نہ کھلا تو کل ضرور کھل جائے گا۔ پہلے پانچ دنوں میں میری ساری پونجی خرچ ہوگئی۔ پھر میں نے بچت کرنا چاہی لیکن نہ کرسکا۔ مجبوراً اپنی سونے کی انگوٹھی اونے پونے داموں بیچ دی۔ وہ رقم خرچ ہوئی تو گھڑی بیچ دی۔ وہ بھی ختم ہوئی تو میرے پاس بیچنے لائق کوئی چیز نہیں تھی۔ ہوٹل والوں نے باہر کا راستہ دکھایا تو فٹ پاتھ پر بریف کیس ہاتھ میں لئے سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ مطلع صاف ہونے کے آثار دور دور تک دکھائی نہیں دے رہے تھے کیونکہ رم جھم بارش ہو رہی تھی۔ اب میرے پاس صرف ایک راستہ تھا کہ یا تو کسی دھرم شالہ کو تلاش کروں یا بھیک مانگوں۔ دھرم شالہ اس لئے تلاش نہ کرسکا کہ عقل پر تہی دستی کے پتھر پڑ گئے تھے اور بھیک اس لئے نہ مانگ سکا کہ بھیک مانگنا غیرت مند آدمی کے لئے کوئی آسان کام نہیں۔ میں نے پاپیادہ ایئرپورٹ کی راہ لی اور کوئی تین گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد وہاں پہنچا۔ بھوک سے بُرا حال تھا۔ رہ رہ کے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا تھا۔ وہ رات میں نے ائرپورٹ سے باہر ایک چھجے کے

داموں)

نیچے گزاری۔ صبح موسم حسب معمول خراب تھا۔ اب میری نظر دھندلا گئی تھی لیکن میں نے ایک جگہ فوجیوں کو لنگر میں دال روٹی لیتے دیکھا۔ میں نے ہمت سمیٹ لی اور من من بھر کے قدم اٹھاتا ہوا لائن کے آخری سرے پر کھڑا ہو گیا۔ کئی یگ بیت گئے۔ دال روٹی بٹتی رہی۔ جب میرا نمبر آ پہنچا تو لنگر کمانڈر نے مجھے پہچان کر دور دھکیل دیا اور دو ایک ہلکی ہلکی گالیاں بھی سنائیں۔ میں پھر لائن کے آخر پر کھڑا ہو گیا۔ باری آنے پر تقسیم کار نے مجھے پھر سے باہر کر دیا اور چار چھ بے نقط گالیاں سنائیں۔ میں تیسری بار حاضر خدمت ہوا تو اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ میری کہانی سن کر مجھے نہ صرف دال روٹی دی بلکہ رہنے کو جگہ اور حوصلہ بھی دیا۔ میں آج نو بجے تک اسی جگہ دال روٹی کھاتا رہا اور زندگی کا ٹھیلا دھکیلتا رہا۔ اگر اللہ نے انسان کے دل میں رحم کا جذبہ نہ رکھا ہوتا تو میں مر کھپ گیا ہوتا۔ اس لئے میں اب مصارف میں اعتدال کی قدر جان گیا ہوں۔ دیکھ بھیا! تم بھی اعتدال کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ یہ بہت بڑی دولت ہے!!" ....

⁂

۱۲. اُلٹی گنگا

فطرت کے اصولوں کی پابندی بقائے حیات کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ جب جب انسان نے ان کے خلاف جانے کی کوشش کی، وہ اپنے پیچھے تباہی و بربادی کے نشان ''آثار قدیمہ'' کی صورت میں چھوڑ گیا۔ مرد، مرد ہے اور عورت، عورت۔ اگر مرد کو عورت اور عورت کو مرد بنانے کی موجودہ روش جاری ہی، تو وہ دن آئے بنا نہیں رہ سکتا جس کے بطن سے ایک ہمہ گیر تباہی جنم لے گی اور یہاں وہاں، اِدھر اُدھر اُس۔ کے آثار بکھرے ہوئے ملیں گے۔ آپ کو اس خیال سے اختلاف کرنے کا پورا حق ہے۔ ویسے بھی میری خامہ فرسائی سے کسی انقلاب کے آنے کی اُمید بہت ہی کم ہے، اس لئے آپ تفنن طبع کے طور پر ہی سہی، میرے تصور کی آب و ہوا میں پنپنے والی اس دنیا کی تھوڑی دیر کے لئے سیر کیجیے:

گھر کے صحن میں پلاسٹک کے ''تجیرے'' شامیانے تنے ہوئے ہیں۔ شامیانوں کے اُس طرف ایک بڑا سا گیس الاؤ جل رہا ہے جس پر پلاسٹک کی فائر پروف دیگیں بق بق کرتے ہوئے بھاپ چھوڑ رہی ہیں۔ خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی ہیں۔ ایک باورچن پلاسٹک کے کفگیر سے شوربہ اُٹھا کر ٹیسٹ ٹیوب میں ڈال رہی ہے۔ ٹیسٹ ٹیوب سے منسلک مشین سے آواز آتی ہے: ''ہیلو، ہیلو!! ٹو ڈگریز مائنس انکریز پلیز۔ آیوڈین لیول نارمل۔ سکرین کی طرف دیکھئے پلیز۔ اوور اینڈ آؤٹ!!'' باورچن سیال نمک کی بوتل کا نوزل دیگ کی طرف کر کے ایک بٹن دباتی ہے اور اسے ایک طرف رکھ کر سگریٹ سلگاتی ہے اور آرام کرسی پر پھیل کے بیٹھ جاتی ہے۔ ہر طرف مرد و زن اور صغیر و کبیر کی ریل پیل ہے۔ کھوئے سے کھوا چھل رہا ہے۔ یکدم ایک مشین کا انڈیکیٹر جلنے بجھنے لگتا ہے اور ''بیپ بیپ'' کی آواز کے ساتھ ہی اس کے مائک سے آواز خارج ہوتی ہے ''یور اٹینشن پلیز'' یور اٹینشن پلیز، برائڈ اپروچنگ۔ ٹو تھاؤزنڈ میٹرس اوے۔ پلیز سٹینڈ اپ فار ری سپشن۔ جنٹس فرسٹ پلیز!'' اس کے ساتھ ہی زور و شور کا میوزک آن ہو جاتا ہے اور کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ پھر سبھی غٹ پٹ ڈانس کرنے لگتے ہیں۔ اتنے میں ایک اُڑن طشتری صحن میں لینڈ کرتی ہے اور برائڈ یعنی دُلہن اس میں سے چھلانگ لگا کر اُترتی ہے۔ کیا جلال ہے! کیا کمال ہے!...... ہیروکٹ بال، سر پر فلیٹ ہیٹ، ہیٹ کی بائیں جانب ہُما کا ٹیکنی کلر پر ایستادہ، آنکھوں پر سیاہ گاگلز، گلے میں رنگین سکارف نکٹائی کی طرح آویزاں، نیوی بلیو کلر کی جیکٹ اور سکن ٹائٹ جینز، پاؤں میں شارک سِکن سے بنا چین والا شکاری بوٹ، کمر میں ''بلیک بیلٹ'' اور اُس کے ساتھ لٹکا ہوا چینی ساخت کا پستول!...... وہ دو منٹ ٹانگیں پھیلائے، کولھوں پر ہاتھ دھرے اپنے گرد و پیش کا عقابی جائزہ لیتی ہے اور پھر اپنے منہ کے چُرٹ کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں حرکت دیتی ہوئی

نپے تُلے قدموں سے آگے بڑھ کر اپنے سسر جی کے ہاتھ سے شیمپئن کا گلاس لے کر اسے غٹا غٹ خالی کر کے بائیں ہاتھ سے اس کی طرف اچھالتی ہے جو اتفاقاً اُس کے جھمکے سے ٹکراتا ہے اور جھمکا ''بریلی کی بازار'' کے بجائے دُلہن کے قدموں میں گرتا ہے۔ سسر جی اسے اٹھانے کیلئے جھکتے ہیں تو ان کے ہاتھوں کے کنگن کھنک اٹھتے ہیں۔ (حالانکہ ہماری آج کی فلمی دنیا میں کنگن آدھی رات کو کھنکتے ہیں یعنی ؏ آدھی رات کو کھنک گیا میرا کنگنا) پھر دلہن اندر قدم رکھتی ہے۔ پردہ گرتا ہے۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو دُلہا لال جوڑے لال چنری کے اندر شرماتا اور لجاتا ہوا دلہن کے پیچھے پیچھے باہر قدم رکھتا ہے۔ کیمرے حرکت میں آتے ہیں، فلش چمکتے ہیں، دولہے میاں کا ایک یارِ جانی اُس سے گھونگھٹ ہٹانے کیلئے کہتا ہے تاکہ اسکے رُخ تاباں کی بھی عکس بندی ہو سکے لیکن وہ دبے لفظوں میں کہتا ہے: ''نوج! ہٹ بے کلموہے۔ کیا تمہیں لاج بھی نہیں آتی!!'' اور وہ آنچل دانتوں تلے دبائے اپنے ''بلما'' کے پیچھے چلتا ہوا اُڑن طشتری میں سوار ہو کے اُڑن چھو ہو جاتا ہے۔ کہیں سے ایک کھٹارا ریڈیو ٹرانسسٹر پر پرانے فلمی گیتوں کے فرمائشی پروگرام میں محمد رفیع کا گایا ہوا یہ گیت بجتا ہے۔

بابل کی دعائیں لیتی جا
جا تجھ کو سکھی سنسار ملے
میکے کی کبھی نہ یاد آئے
سسرال میں اتنا پیار ملے

خواتین وحضرات! اب ذرا تصور کی اس دنیا سے باہر تو آیئے اور غور کیجئے کہ اس جوڑے کے ساتھ جب تیسرا وجود شامل ہوگا تو راشن کارڈ یا انڈمشن فارم بھرتے وقت ''ولدیت'' کے کالم میں وہ لوگ کس کا نام لکھیں گے!؟؟

◆

۱۳. ناچ سکو تو ناچو

اگر مناسب آب و ہوا اور ماحول میسر نہ ہو تو زبردست قوتِ نمو رکھنے کے باوجود پودا مرجھا کے رہ جاتا ہے لیکن انسان ناموافق ماحول کے اندر بھی کسی نہ کسی حد تک پنپ سکتا ہے کیونکہ وہ بہر حال نباتات و جمادات پر فوقیت رکھتا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

تقدیر کے پابند ہیں نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

اکثر باصلاحیت لوگ حالات کی نامساعدت کا رونا روتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتے۔ نتیجے کے طور پر اُن کی صلاحیتیں نباتات کے سے انجام سے دوچار ہو کر پیوند خاک ہو جاتی ہیں۔ ان لوگوں کا تو کچھ خاص نہیں

بگڑتا لیکن ملک وملت اُن کی صلاحیتوں سے فیضیاب ہونے سے رہ جاتی ہے۔ ہمارا ملک وہ ملک نہیں جہاں ٹیلنٹ (Talent) کو دریافت کیا جائے۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں ٹیلنٹ کے سر اُبھارتے ہی اُس کا قلع قمع کرنے کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔ اس میں واقعتاً اُن لوگوں کا سفلی جذبہ کارفرما ہوتا ہے جو نااہل ہونے کے باوجود بانس پر چڑھے ہوئے ہیں۔ بانس کے یہ سوار طوفانوں کا تو خیر کیا مقابلہ کریں گے، محض ہوا کے جھونکوں سے بھی لڑھک جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے چاہنے نہ چاہنے اور کرنے نہ کرنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ ؎

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے گی جسے روشن خدا کرے

لیکن اس کے لئے ایک شرط ضرور ہے کہ انسان کو اپنی صلاحیتوں پر اعتماد او بھروسہ ہو۔ جہاں یہ دو چیزیں پائی جاتی ہوں وہاں کا پانی اپنا راستہ خود بنالیتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اعتماد اور بھروسہ یوں ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے حصول کے لئے پیشانی کے پسینے سے آنکھوں کے دئے جلانا پڑتے ہیں۔

میں ایک شخص کو جانتا ہوں۔ اس میں اعلیٰ پائے کا شاعر اور ادیب بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی لیکن بدقسمتی سے کچھ بھی نہ بن سکا حالانکہ نہ ہی کسی رقیب نے اس کی ٹانگ کھینچی تھی اور نہ کسی رفیق نے جُل دیا تھا۔ میں اس سے کبھی پوچھتا ہوں تو عذراتِ لنگ کی ایک فہرست پیش کرتا ہے: "دیکھو بھائی! اِدھر ایم۔ اے کیا، اُدھر کمبخت محکمے نے لداخ ٹرانسفر کیا۔ وہاں دو سال ننگ دھڑنگ اور بے آب ورنگ پہاڑوں سے اُلجھتا رہا۔ وادی واپس آ گیا تو والد بزرگوار داغِ مفارقت دے گئے۔ ابھی داغ محتاجِ اندمال تھے کہ والدہ صاحبہ سدھار چلیں۔ یہ زخم بھرنے کو تھا کہ بچوں کی پڑھائی کا دیوہیکل مسئلہ سامنے آن کھڑا ہوا۔ کسی نہ کسی طرح اس مسئلے کو حل کیا کہ محکمے نے ایڈمنسٹریشن میں گھسیٹ لیا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وادی

میں ایڈمنسٹریشن کا میدان کس قدر خاردار ہوتا ہے۔ یہاں کا ایڈمنسٹریٹر تو بس موم کی ناک ہوتا ہے جس کو جہانِ سیاست کا کوئی بھی حلقہ یا دیہہ پریزیڈنٹ اپنی مرضی کے مطابق آگے پیچھے دائیں بائیں گھما سکتا ہے۔ اب خدا خدا کر کے ریٹائر ہوا تو رہائشی مکان کی غیر متوقع پرابلم کھڑی ہوگئی۔ میں نے اپنے وقت میں باید وشاید قسم کا مکان بنالیا تھا لیکن فرزندانِ ارجمند فیشن ایبل مکان چاہتے ہیں جو شیش محل سے مشابہ ہو۔ میں لاکھ سمجھاتا ہوں کہ اے دیوانو! تم شیش محل میں کیا رہو گے جبکہ دن رات بھائیں بھائیں گولیاں، گرینیڈ، راکٹ اور بم چل رہے ہوں۔ تمہیں تو کوئی زمین دوز کنکریٹ مورچہ بنکر بنا کے رہنا چاہئے تاکہ سلامت رہ سکو!! لیکن آج کوئی کسی کی سنتا ہے جو وہ میری سنیں۔ وہ سینہ تان کر کہتے ہیں کہ ”ایک دن تو سب کو مرنا ہے، ہمیں موت سے مفر کہاں!؟ اس لئے جب مرنا ہی ہے تو کیوں نہ شیش محل میں مریں۔ بنکر میں مرنا بھی کوئی مرنا ہوتا ہے!؟ یعنی ۔

موت وہی جو دنیا دیکھے
گھُٹ گھُٹ کر یُوں مرنا کیا
جب پیار کیا تو ڈرنا کیا

پھر میں خیالات کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ جب حالات اس قسم کے ہوں تو میں اپنی صلاحتوں کو کیسے بروئے کار لاسکوں گا۔ جب آنگن ہی ٹیڑھا ہو تو کوئی ناچنے کا کمال کیا خاک دکھا سکتا ہے!؟“ یہ سن کر میں اسے ندا فاضلی کا یہ شعر سناتا ہوں اور وہ خاموش ہو جاتا ہے۔

ناچ سکو تو ناچو، تھک جاؤ تو آرام کرو
ٹیڑھا کیوں گھر کا آنگن ہے، جیتے جاؤ سوچو مت

* * *

۱۴. پھول، پت جھڑ کا

اسلام کی تمام تر عمارت تصورِ جوابدہی پر کھڑی ہے۔ اگر کوئی مسلمان ایک بھی سانس قرآن کی آب وہوا سے باہر نہیں لیتا لیکن آخرت کی جوابدہی کے سلسلے میں مذبذب اور ڈھلمل یقین ہے، تو وہ ''مسلمان'' نہیں ہوسکتا۔ پیغمبروں کی زندگیاں مختلف ادوار میں لوگوں کو یہی باور کرانے کی کوششوں میں عذابِ مسلسل بنتی رہی ہیں کہ لوگ اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کریں اور اس دنیا میں رہتے ہوئے اُس دنیا کی تیاری میں لگے رہیں۔ قرآن مجید تو اعمالِ نیک کی جزا اور اعمالِ بد کی سزا کی تفاصیل سے بھرا پڑا ہے کہ لوگ آخرت میں کس طرح اعمال کی پاداش میں لطف وکرم یا تعذیب وتادیب سے ہمکنار ہوں گے۔ لیکن سب کچھ تسلیم کرتے ہوئے

بھی وسوسوں کا ابلیس کبھی کبھی قیل وقال کا روپ دھار کر انسان کو اُکسانے لگتا ہے:

''جی کون سی آخرت؟ کیسی آخرت؟ کون سی جوابدہی؟ کون سی جزا و سزا؟ کون سی جنت اور کون سا جہنم؟؟...... کون اپنی آنکھوں سے دیکھ کے آیا ہے کہ وہاں نیکو کاروں کو جنت کی نعمتیں اور بدکاروں کو جہنم کی صعوبتیں ملیں گی؟ جی سب افسانہ طرازی ہے۔ سچ وہ ہے جس کو ہم دیکھ رہے ہیں، باقی سب واہمہ ہے۔ بقول شاعر؎

آگے بھی جانے نہ تُو پیچھے بھی جانے نہ تُو
جو بھی ہے بس یہی اِک پَل ہے
جینے والے سوچ لے یہی وقت ہے کر لے پوری آرزو

ایک بار ایک بالکل سیدھے سادے اَن پڑھ آدمی نے مجھے ایک بالکل سیدھی سادی سی بات بتادی۔ مجھے بہت ہی بھلی اور پیاری لگی۔ ممکن ہے کہ آپ کو بھی پیاری لگے، اس لئے اپنے الفاظ میں ڈھال کر سناتا ہوں:

''ایک بہت بڑا دریا ہے۔ اس دریا میں اَن گنت اجسام ہیں۔ لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں مچھلیاں ہیں۔ کچھ چھوٹی کچھ بڑی، کچھ رنگین، کچھ بے رنگ، کچھ مفید کچھ مضر، کچھ کالی کچھ سفید، کچھ خوبصورت کچھ بدصورت، کچھ آدم خور کچھ آدم نواز! یہ سب بے فکری سے اپنی اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق پانی میں تیرتی ہوئی اقتضائے فطرت کی تشکیل اور تکمیل میں لگی ہوئی ہیں۔ ایک جگہ پانی میں لوہے کا ایک نوکدار کانٹا اپنی اصلیت پر دلکش چارے کا خول چڑھائے اِدھر اُدھر ڈول رہا ہے۔ مچھلیاں اُسے دیکھتے ہی منہ مارنے کے لئے لپکتی ہیں۔ ایک یگانۂ دریا اسرار شناس مچھلی نمودار ہو کر انہیں حلق کے بل پکارتی ہوئی مخاطب کرتی ہے خبردار!! اس خوبصورت اور دلکش شئے سے دُور رہو۔ اس کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ میں اس کی اصلیت اور ماہیت سے واقف ہوں۔ یہ چارہ اور غذا دکھائی دیتی ہے

لیکن اصل میں یہ خمیدہ لوہے کا نوکدار کانٹا ہے۔ یاد رکھو، جس نے بھی اِس پر منہ مار لیا، یہ اُس کے حلق میں پھنس جائے گا۔ پھر تم لاکھ تڑپو گی لیکن اس کی نوک ہر تڑپ کے ساتھ تمہارے گلے میں گہری چبھتی چلی جائے گی۔ جب شکاری کو احساس ہوگا کہ مچھلی پھنسی ہے تو وہ تمہیں اوپر کھینچ لے گا۔ ایک نئی دنیا میں، جس کے اوپر نیلا نیلا آسمان ٹنگا ہوا ہے۔ آسمان میں سورج، چاند، ستارے چمک رہے ہیں۔ گرمی ہے، سردی ہے، رات ہے، دن ہے، بہار ہے، خزاں ہے، وغیرہ وغیرہ ۔ وہ شکاری بڑی بے دردی سے تمہارے گلے سے کانٹا کھینچ لے گا۔ تمہیں خون کی اُبکائیاں آئیں گی لیکن وہ پروا نہیں کرے گا۔ پھر وہ اپنی جیب سے ایک بڑا چاقو نکالے گا۔ اسے پتھر پر گھس کر دھار دے گا اور تمہیں زندہ ہی ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ اس کے دل میں کوئی جذبۂ ترحّم نہیں ہوگا کہ تمہارے تڑپنے سے پسیجے ۔ پھر اُن ٹکڑوں کو دھو کر آگ پر چڑھی ہوئی کڑھائی کے کھولتے اُبلتے تیل میں ڈال دے گا۔ کروٹ کروٹ دھیرے دھیرے تل لے گا۔ کڑھائی سے نالہ وفریاد بلند ہوتی رہے گی لیکن وہ کوئی اثر قبول نہیں کرے گا۔ اس لئے میرے بیان کی صداقت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کانٹے سے دور رہو، وگرنہ مذکورہ انجام تمہارا مقدر ہے!!!

یہ سب سن کر کچھ مچھلیاں خوف کھا کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں لیکن کچھ تمسخر اُڑاتی ہوئی چارے پر منہ مارتی ہیں۔ اُسے نگلتے ہی وہ یگانۂ دریا اسرار شناس مچھلی کی پیشگوئی پر ایمان لاتی ہیں لیکن وہ شیوۂ تسلیم بعد از وقت ہوتا ہے جو پت جھڑ کے پھول کی طرح بار آور نہیں ہوتا۔ پھر ان کے سامنے وہی خون، وہی آگ اور وہی بے دردی ہوتی ہے لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتیں، کچھ بھی نہیں کیونکہ تہہِ آب دُنیا کے اصول وقوانین الگ ہوتے ہیں اور سطحِ آب دنیا کے الگ!!

⁂

۱۵. اظہارِ حق

کسی فارسی شاعر نے کہا ہے۔

گفتارِ صدق مایۂ آزارمی شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود

یعنی سچی بات وجہ تکلیف بنتی ہے۔ جب کوئی حرفِ حق کو بلند کرتا ہے تو یہی اس کے لئے تختۂ دار بن جاتا ہے۔ یہ تصور قرآنِ پاک کے ارشادات سے میل نہیں کھاتا کیونکہ قرآن کے مطابق جب حق آتا ہے تو باطل مٹ جاتا ہے اور باطل یقینی طور سے مٹ جانے والی چیز ہے۔ لیکن باطل کو مٹتے مٹتے ذرا دیر لگتی ہے۔ آفتاب عالم تاب اندھیرے کو فنا کے گھاٹ اُتار دیتا ہے لیکن آج تک یہ کبھی نہیں دیکھا گیا

کہ سورج یکدم مشرق سے نمودار ہوا اور پلک جھپکتے ہی نصف النہار پر پہنچ کر اندھیرے کی فنا کا باعث بنا۔ پہلے بہت ہی ہلکی روشنی آتی ہے جس سے صفحۂ زمین پر رہنے بسنے والوں کو سورج کے آنے کا گمان ہوتا ہے۔ یہی ہلکی روشنی بتدریج روزِ روشن میں تبدیل ہوتی ہے اور پھر اندھیرے کے قدم اُکھڑ جاتے ہیں۔ روشنی کے جنم سے اُس کے ظہور تک جو مرحلہ ہوتا ہے، وہ آزمائش و امتحان کا ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر عام لوگ روشنی کے بارے میں متذبذب رہتے ہیں کہ یہ آئے گی بھی یا نہیں، آئے گی تو کس طرح آئے گی، آکر کیا کرے گی اور اس کے کرنے کا عمل کیسا ہوگا؟ لیکن ایمانِ راسخ رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ سورج اور روشنی کی آمد یقینی اور حتمی ہے کیونکہ یہ اصولِ فطرت ہے جو قیامت کی آمد کے ساتھ ہی تبدیل ہوسکتا ہے۔

اب کبھی کبھی کوئی جب حق کی بات کہتا ہے (غیر شعوری طور پر ہی سہی) تو لوگ سیخ پا ہو کر اس کے درپئے آزار ہو جاتے ہیں۔ باریک مثالوں سے قطع نظر، آپ کبھی کسی گنجے کو انتہائی شائستہ انداز میں ''گنجا'' کہہ دیجئے اور دیکھئے کہ آپ کا گریبان ہوگا اور اُس کا ہاتھ۔ حالانکہ وہ خود بھی اعتراف کرے گا کہ گنجے کو صرف ''گنجا'' ہی کہا جاسکتا ہے ''گیسودراز'' نہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حق اگرچہ بہرحال حق ہے لیکن حق کو حق کے ساتھ پیش کرنا لازم ہے۔ حق کو حق کے ساتھ پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ایک سلیقہ ہونا چاہئے۔ سلیقے کی عدم موجودگی میں حق اگرچہ حق ہی رہتا ہے لیکن اس کے دائرہ اثر و نفوذ میں منفی ردِّعمل اُبھرتا ہے۔

آپ کو یقین کرلینا چاہئے کہ ایک بار میرے ساتھ تقریباً اسی قسم کا حادثہ پیش آچکا ہے...... ایک اجنبی صاحب میرے شریکِ سفر تھے۔ شاید دوسروں کے جذبات سے کھیلنا اُس کی ''ہابی'' تھی۔ اس نے خواہ مخواہ کچھ ایسی سنجیدگی سے

میرے چہرے کا جائزہ لینا شروع کیا کہ میں پریشان ہوگیا۔ میں نے جواباً اس کے سجے سنورے بالوں، پھولدار نکٹائی، کریم کلر تھری پیس سوٹ، چمکتے کالے جوتوں، بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں، ستواں ناک اور متوازن سرخی مائل گورے چہرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ سب دیکھ کر اُس کے چند ساتھی نظروں کے اس مقابلے کو دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ ایک لمبے وقفے کے بعد وہ اجنبی دوست مجھ سے پُرخیال انداز میں کہنے لگے:

"جناب عالی! میرا خیال ہے آپ کی دائیں مونچھ بائیں مونچھ سے ذرا بڑی ہے!"

اُس کے خیال کو منظور نہ کرتے ہوئے میں نے پوچھا: "کیا آپ یہ بات یقین سے کہہ رہے ہیں؟"

"بالکل! صد فی صد یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں!"

"پھر تو آپ یقیناً حجام ہوں گے...... کیونکہ صرف ایک حجام ہی مونچھوں سے متعلق اتنے وثوق سے کوئی بات کہہ سکتا ہے"۔

اس کے ساتھیوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ مجھے اس قہقہے پر حیرانی ہوئی۔ مجھ پر بہت دیر بعد یہ انکشاف ہوا کہ موصوف واقعی پشتینی حجام ہی تھے۔ اب وہ اُس روز سے میرے دشمنِ جاں بنے ہوئے ہیں اور مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے حق کو ذرا بھونڈے طریقے سے پیش کیا تھا اور وہ بھی غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر۔ لیکن کیا اس میں میرا کوئی قصور ہے؟...... یہ فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں!

⁂

١٦. احساسِ گناہ

? شاید یہ حدیث شریف کا خلاصہ ہے کہ جب انسان ایک گناہ کرتا ہے اور پھر تائب نہیں ہوتا، تو اس کے دل پر سوئی کی نوک کے برابر کالا دھبہ پڑ جاتا ہے۔ جب یہ عمل مدتِ دراز تک جاری رہتا ہے تو ان کالے دھبّوں کی کثرت سے سارے کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ سیاہ دل شخص محاورۃً ہی نہیں بلکہ حقیقتاً بھی شقی ہوتا ہے اور شقاوتِ قلبی کسی بھی انسان کی بدترین صفت ہے۔

گناہ کا ارتکاب اقتضائے فطرتِ انسانی ہے۔ جس سے گناہ سرزد نہیں ہوگا وہ یقیناً انسان نہیں ہوگا۔ جس طرح سے کوئی انسان ''بے غم'' نہیں ہوسکتا اسی طرح سے ''بے گناہ'' بھی نہیں ہوسکتا۔ لیکن اقتضائے فطرتِ انسانی کے سامنے بے بس ہو کر کبھی گناہ کا مرتکب ہونا ایک بات ہے اور گناہ کو اپنی فطرت پر حاوی کرنا بالکل

الگ بات ہے۔ میں نے ایسے انسان بھی دیکھے ہیں جو اللہ کی مقررہ حدود کو پار کرنا تو دور کی بات، ان کے پاس پھٹکنے سے بھی احتراز کرتے ہیں اور ان لوگوں سے بھی سابقہ پڑا ہے جو حدود کو روندنا تو معمولی بات، ان سے میلوں آگے نکلنے کو بھی درِ خودِ اعتناء نہیں سمجھتے۔ 1970ء میں میری ڈیوٹی کرگل (لداخ) میں تھی۔ ہم تین آدمی میس (Mess) بنا کر ایک کمرے، ایک کچن اور ایک باتھ روم پر مشتمل ریت کی اینٹوں سے تعمیر شدہ ''مکان'' میں رہتے تھے۔ ان دنوں کرگل کا قصبہ چونکہ زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھا، اس لئے ہوٹلوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ بس دو ایک ڈھابے تھے جو اپنے گاہکوں کو کھانے پینے کا معمولی سامان فراہم کر کے سرِ شام ہی بند ہو جایا کرتے تھے۔ سرینگر سے لیہہ جانے کے لئے کرگل چونکہ پہلا پڑاؤ ہے، اس لئے لیہہ جانے والے مسافروں کے لئے کرگل میں رات گزرانا ایک انتہائی دقّت طلب مسئلہ بن جاتا تھا کیونکہ گاڑیوں کی ''کانوائے'' اکثر شام ڈھلے کرگل میں وارد ہوتی تھی۔ خوش قسمت مسافر جان پہچان کے کشمیری ملازموں کے ڈیروں میں کسی نہ کسی طرح کھپ ہی جاتے تھے اور بدقسمت، دو کانوں کے چھجوں تلے رات بھر گھنٹوں میں سردئے ریت اور چٹانوں کے دیس کی ٹھنڈی ہوا کھاتے رہتے کیونکہ سفر بہر حال سفر ہوتا ہے جو اپنے قواعد وضوابط خود وضع کرتا ہے اور کوئی ولی عہد سلطنت دم نہیں مار سکتا!!

گزار

پولیس میں نئے نئے بھرتی ہونے والے ایک پنڈت جی جب بدقسمتوں میں شامل ہونے ہی جا رہے تھے تو خوش قسمتی سے ہم تین یارانِ سفر کا اُدھر سے گزر ہوا۔ اس کی حالت زار ہم سے نہ دیکھی گئی۔ ہم نے اُسے اپنے ڈیرے پر لیا اور جائے پناہ فراہم کر کے اس کی حسب مقدور تواضع کی۔ صبح چار بجے جب گاڑیوں کی لیہہ کے لئے روانگی کا شور شرابہ شروع ہوا تو ہم نے اسے زادِ راہ کے طور پر کچھ روٹیاں بس سٹاپ پر تھما دیں اور رُخصت کیا۔ جب ہم واپس ڈیرے پر پہنچ گئے تو

کف افسوس ملتے رہ گئے کیونکہ پنڈت جی کینواس کا ایک چھوٹا سا تھیلا ہمارے ہاں بھول گئے تھے۔ ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس میں کوئی دو کلو آلو اور پیاز تھے۔ ہم نے اسے کونے والی میز کے نیچے رکھ دیا اور یہ خیال دل سے نکالا کہ ہم اس کی امانت اس تک کبھی پہنچا سکیں گے کیونکہ معاملہ کوئی ڈھائی سو کلومیٹر کا تھا۔

ایک ٹھنڈی رات کو کسی نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے کسمساتے ہوئے بستر سے نکل کر کنڈی کھول دی۔ ایک شخص جب کمرے کی روشنی میں آ گیا تو میرے ایک ساتھی نے خوشی کی چیخ ماری: "ارے اکبر صاحب، آپ!؟" اور وہ اس سے لپٹ گیا۔ پُرسشِ احوال پر معلوم ہوا کہ ان کی گاڑی نامساعد موسم کی وجہ سے درۂ زوجیلا کے آخری موڑ (کیپٹن موڑ) پر پھنس گئی تھی جس کی وجہ سے وہ رات گئے کرگل پہنچ سکے۔ وہ بیٹھ گئے تو معلوم ہوا کہ وہ محکمہ.......... میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھے۔ لیکن اُس وقت اُن کے اعلیٰ عہدے سے مرعوب ہونے کا وقت نہیں تھا بلکہ ان کے پیٹ کو بھرنے کا مسئلہ تھا جو پوری طرح سے خالی تھا۔ ہم وہاں روز کنواں کھودنے اور روز پانی پینے کی سی زندگی گزارتے تھے کہ چار بجے ڈیوٹی سے آتے ہوئے ساگ سبزی خریدی اور اسے رات کو سپردِ شکم کر کے پڑ رہے۔ البتہ چائے کا سامان رکھا رہتا تھا۔ سو چائے بنالی اور مہمان کی خدمت میں پیش کی اور وہ بھی خالی خولی! لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ "فکرِ نان کن خربوزہ آب است" (روٹی کی فکر کرو کیونکہ خربوزہ پانی ہونے کی وجہ سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔) اس لئے ہم نے راشن کے رکھے ہوئے چاول پکانا شروع کئے لیکن سالن کے لئے ہمارے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔ سکوتِ نیم شب، ہم تین، ایک مسافر بیوروکریٹ، سٹو پر پکتے ہوئے چاول، موم بتی کی زرد زرد سی روشنی اور بے بسی! اب پاس پڑوس میں ہماری کوئی خالہ بھی نہیں رہتی تھی کہ اس سے تھوڑا سا بچا ہوا سالن ہی مانگ لیتے اور معزز مہمان کی خاطر تواضع کرتے۔ معاً میں نے کہا "ارے بھئی! وہ تو رکھے ہیں اُس

بھلے مانس پنڈت جی کے آلو اور پیاز! دو چار لے کے مہمان کو کھلائیں گے اور صبح نئے رکھ دیں گے!'' دوسرے نے ''ہُرّا'' کہہ کر میرا سمرتھن کیا لیکن تیسرا اَڑ بیٹھا: ''دیکھو خبردار! یہ امانت ہے۔ کم سے کم میری زندگی میں انہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ آج آلو کی خیانت ہوئی تو کل دوسری چیز کی ہوگی اور پرسوں تیسری کی۔ یاد رکھو کثرتِ گناہ احساسِ گناہ کو ختم کرتی ہے۔ جب احساسِ گناہ ختم ہو جاتا ہے تو گناہ، گناہ نظر نہیں آتا، کھیل تماشا دکھائی دیتا ہے!'' سب خاموش ہو گئے اور معزز مہمان نے نمک ملا کر چاول (بھات) کھانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی!!

⁂

یا اولوا الالباب والابصار

۱۷. یا اُولوالاباب والبصار

کہتے ہیں ''بود ہم پیشہ را ہم پیشہ دُشمن'' یعنی ایک پیشے کے لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ جہاں تک منشائے خداورسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے یہ نہج غلط ہے لیکن جہاں تک زمینی حقائق کا تعلق ہے، یہ ہمارا شعار ہے...... ایک قصائی نے دوکان کھولی اور وہ چل نکلی۔ اس کے ایک ہم پیشہ کو خبر ہوئی تو اُس نے دن رات ایک کر کے اُس کی ناک کے نیچے دوکان کھولی۔ مقابلہ شروع ہوا۔ چند دن بعد ایک افواہ کسی پبلک لیٹرن کی سرانڈ کی طرح ہر طرف پھیل گئی کہ اول الذکر قصائی ذبح کے صحیح طریقے سے چونکہ واقف نہیں، اس لئے اُس کے ہاں کا گوشت بے مزہ ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہی گوشت لوگوں کو پھیکا لگنے لگا جس کی تعریفوں میں چند ہی روز پہلے وہ رطب اللسان رہتے تھے۔ کچھ دن اور گزر گئے کہ

ثانی الذکر قصائی کے بارے میں لوگ قسمیں کھا کھا کر کہنے لگے کہ وہ جب دوکان سے اُٹھ کر رفع حاجت کے لئے جاتا ہے تو واپسی پر وضو نہیں کرتا۔ یہ سن کر مالِ یتیم کھانے والے اور شب وروز غیبت کرنے والے لوگ تک کراہت محسوس کرنے لگے کہ اُس کے ہاں کا گوشت کھا کر ان کا دین وایمان خطرے میں پڑ گیا ہے۔ وقت گزرتا گیا اور ایک دن دونوں دوکانیں بند ہوگئیں۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ ہر دو قسم کی افواہیں خود انہی کی اُڑائی ہوئی تھیں جو ان کے لئے باعث زوال بن گئیں۔

قصائی، نائی، درزی وغیرہ کی حد تک پیشہ وارانہ رقابت کو کسی حد تک برداشت کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ لوگ عام طور سے یا تو تعلیم یافتہ نہیں ہوتے یا اگر ہوتے ہیں تو اتنے نہیں ہوتے جہاں سے انسان کے پاکیزہ شعور کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ لیکن جب بات دانشوروں اور حکیموں کی ہو، تو معاملہ انتہائی گمبھیر بن جاتا ہے۔ میرے خیال میں جس کے بھی ہاتھ میں ''قلم'' ہے، وہ دانشور اور حکیم ہے۔ چاہے وہ شاعر ہو یا ادیب، محقق ہو یا تنقید نگار یا کچھ اور۔ علم ودانش چونکہ پیشہ نہیں ہے بلکہ پیغمبروں کی میراث ہے، اس لئے اِس میں پیشہ وارانہ رقابت کا پایا جانا انتہائی مکروہ ہے۔ اگر دانشور بھی رقابت کو اپنائے تو اس میں اور قصائی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ لیکن زمینی حقیقتیں پکار پکار کے کہتی ہیں کہ دانشوروں کی دنیا میں حسد ورقابت کے حربے پیشہ وروں سے بھی گئے گزرے اور اوچھے ہیں۔

ایک نوجوان ونوآموز شاعر نے خوبصورت غزل کہی۔ دوسرے سینئر شاعر کو اُس کے ''ہِٹ'' ہونے کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اس نے اپنی بے ہنگم غزل کا شین قاف کسی اُستاد فن کو سو پچاس روپے دے کر درست کرایا اور میڈیا پر اُس کے نشرواشاعت کیلئے کچھ لوگوں کی چاپلوسی کی۔ پھر ایک ناخواندہ یا نیم خواندہ گلوکار کے پاؤں داب کر اُسے گوایا۔ پھر ریاست کے طول وعرض سے فرضی تعریفی اور

فرمائشی خطوط بھجوائے اور چند ہی دنوں میں اصلی شاعر تو پس منظر میں چلا گیا اور نقلی شاعر کا ہر طرف طوطی بولنے لگا۔

ایک گمنام ادیب نے کسی ادبی محفل میں اپنا مقالہ پڑھا۔ ادبی دنیا کے ایک چودھری اور اپنے آپ کو ہر محفل کا "میرِ محفل" بنوانے والے نام نہاد ادیب کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُس کی راتوں کی نیند خراب ہونے لگی۔ اس نے وہ داوٗ پیچ لڑائے کہ سارے کا سارا ماحول گمنام ادیب کے لئے مکدر ہو گیا...... مثالیں صرف دو نہیں، ہزاروں ہیں لیکن میں کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ "کسی کو وقت سے پہلے اور قسمت سے زیادہ" کبھی نہیں ملتا۔ اس لئے ایک پیشہ ور دوسرے کی روزی روٹی اور عزت و آبرو کا لاگو کیوں ہو جائے؟! اگر کوئی ہوتا ہے تو وہ اپنے جہنم کا ایندھن اپنے ہاتھوں سے کاٹ کر اور اپنے کاندھوں سے ڈھو کر خود جمع کرتا ہے۔ لیکن نصیحت قرآنِ پاک کے مطابق صرف اولوالالباب (صاحبانِ عقل و خرد) اور اولو الابصار (صاحبانِ بصیرت) ہی قبول کرتے ہیں!!

بسر

●●●●

۱۸. بنگلہ دیشی سوٹ[۱]

لوگ اکثر زمانے کو دوش دیتے اور کوستے ہیں حالانکہ اسلام نے زمانے کو بُرا کہنے کی سخت ممانعت کی ہے۔ لیکن یہ چونکہ فطرتِ انسان کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی طبیعت کی مخالف سمت میں جانے والی ہر چیز سے بیزار رہتا ہے، اس لئے جب کبھی زمانہ سازگار نہیں رہتا تو انسان بوکھلا کر اول جلول بکنے لگتا ہے۔ زمانے کی ناموافقت دائمی نہیں ہوتی۔ یہ کبھی کبھی ایسا موافق بن جاتا ہے کہ رفیق نظر آنے

اول جو

---

[۱] بنگلہ دیش معرضِ وجود میں آیا تو مخیرّ ممالک نے امداد کے طور پر وہاں ملبوسات کی کافی مقدار بھیج دی تھی۔ اُس زمانے میں اُن کپڑوں کو سمگل کر کے کشمیر بھی لایا جاتا تھا اور لوگ آسانی سے ان کو کباڑیوں کے ہاں سے خرید سکتے تھے۔ چنانچہ آج بھی یہاں نیلام ہونے والے اور کباڑیوں کی دوکانوں پر ملنے والے کپڑوں کو ''بنگلہ دیشی'' کہا جاتا ہے۔

مستعمل

بکنے

لگتا ہے۔ اس کی بس ایک موافقت دیکھ لیجئے کہ دورِ جدید کے انسان نے بہت ''ترقی'' کی۔ اس ترقی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اب بازاروں میں ہر چیز ''ریڈی میڈ'' ملتی ہے۔ مثلاً آپ کو سالن کے لئے ہلدی کی ضرورت ہے تو جا کے کسی بھی دوکان سے گائے چھاپ، بیل چھاپ، گھوڑے چھاپ ہلدی کا پیکٹ لیجئے۔ بلیڈ سے کاٹ کر حسب ضرورت سالن میں ٹپکائیے۔ تو بخیر مابہ سلامتی (بلیڈ پاس نہ ہو تو یہ کام دانتوں سے بھی لیا جا سکتا ہے)۔ اب اس بات کی آپ کو کیا پروا کہ ہلدی اسم بامسمی ہو اور پیکٹ میں ہلدی کے ساتھ گوبر یالید شیر و شکر کی طرح نہ ملی ہو۔ یا آپ کو مرچ مصالحے کی ضرورت ہے تو دوڑ کے نکڑ کی دوکان سے ترک بھڑک والے لال پیلے پولی تھین لفافے کو لائیے اور حسب ذائقہ سالن میں ٹپکائیے۔ نہ کوٹنے کا جھنجھٹ نہ پیسنے کی پریشانی۔ جلدی جلدی کھانا کھائیے اور دفتر کیلئے روانہ ہو جائیے۔ اس بات کی آپ کو کیا فکر کہ سالن میں رنگ تو ہے لیکن تیکھا پن اور لطف خاک بھی نہیں کیونکہ حب رقیب محبوب کی گالیاں کھا کے بے مزا نہیں ہوتا تو کوئی مرچ مصالحہ کے ساتھ رنگ وروغن یا اینٹ گاڑے کا چورن کھا کے بے مزہ کیوں ہو جائے ؎

کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

یا خدانخواستہ آپ کا ٹرانسفر کسی فرنٹیر علاقے میں ہوتا ہے۔ آپ کو جوائننگ ٹائم کے طور پر صرف پندرہ دن مل سکتے ہیں اور آپ کے پاس گرم کپڑے نہیں ہیں۔ آپ بے شک بازار سے کپڑا لا کر ایک بہترین گرم سوٹ سلوا سکتے ہیں لیکن درزی کو کپڑا دینے اور سوٹ پہننے کے درمیان عمرِ خضرؑ کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اِدھر فرصتِ زندگی نپی تلی ہے۔ اب ایسی سچویشن میں کوئی کیا کرے؟...... جناب! زمانے کی ادا پر نثار۔ جا کے لوگوں کی نظریں بچاتے ہوئے ''بنگلہ دیشی'' کپڑوں کی کباڑی دوکان سے اپنے معیار کا گرم سوٹ کوڑیوں کے بھاؤ خریدئے اور

''صاحب'' بن کر فرنٹیر کے باسیوں پر رعب جمائیے!!

ریڈی میڈ چیز پہننے کی ہو تو یہ اکثر سائز میں کم یا زیادہ پڑتی ہے۔ پتلون کوٹ یا تو ڈھیلا ڈھالا ہوگا کہ لوگوں کو ایسا لگے گا کہ آپ نے سوٹ نہیں پہنا ہے بلکہ سوٹ نے آپ کو پہن لیا ہے۔ یا سوٹ اتنا تنگ اور چھوٹا ہوگا کہ پہنتے وقت گول سوراخ میں چوکور کھونٹا ٹھونسنے کی مثل صادق آئے گی۔ (A square peg in a round hole)

صرف ایک ریڈی میڈ چیز بازار میں ایسی ملتی ہے کہ جو اگرچہ ملاوٹی بھی ہوتی ہے اور نادُرست بھی، لیکن اس کی ملاوٹ اور نادرستگی کو بھانپا نہیں جاسکتا۔ وہ ہے ''ریڈی میڈ مہمان خصوصی''...... آپ کو کبھی کسی تقریب کے لئے مہمانِ خصوصی درکار ہو تو پریشاں ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ البتہ زائدالمعیاد ہوں گے یعنی Expired۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ آج کل جب زائد المعیاد ادویات کا لیبل بدل کر انہیں قابل استعمال بنایا جاسکتا ہے او رقبول کیا جاسکتا ہے تو زائد المعیاد ''مہمانِ خصوصی'' کو کیوں قبول نہیں کیا جاسکتا؟! اور پھر ان بے چاروں کو کچھ سہولت تو ملنی چاہئے۔ یہ اپنے زمانۂ ملازمت کے سنبھال کر رکھے ہوئے سوٹ بوٹ اور نکٹائی سے کام چلانے والے لوگ ہوتے ہیں کیونکہ ان کے کمائے ہوئے مال میں برکت نہیں ہوتی کہ وہ دو چار نئے سوٹ اور پھول دار نکٹائیاں بنواسکیں۔ ایک بات دھیان میں رہے کہ ان کے ریٹ مقرر ہیں۔ ایک عدد ''فل وازہ وان''، لفٹ کے لئے خرچ والی رقم یعنی کرایہ اور موسمی میوے کی ایک پیٹی۔ (پیٹی تین نمبر کی بھی ہو تو مضائقہ نہیں)۔ ہاں غریب مجلسوں کے میزبانوں کے لئے خصوصی رعایت ہے کہ وہ ''وازہ وان'' کی جگہ ایک چوزۂ مرغ اور ڈیلیشس سیب کی جگہ ''مہاراجی'' سے بھی تواضع کر سکتے ہیں۔ اگرچہ مہمانانِ خصوصی کی بہتات ہے پھر بھی انہیں بُک کرنے میں جلدی کرنا سود مند

رہے گا کیونکہ یہاں ادبی انجمنیں بے شمار اور میرِ محفل لوگوں کی تعداد ''باشمار'' ہے۔ کیا بھروسہ کوئی اونچی بولی لگا کے نمبر وَن بنگلہ دیشی سوٹ خرید کے لئے جائے اور آپ ہاتھ ملتے رہ جائیں !!

⁂

۱۹. بومبرو بومبرو......

وہ ایک جنت نظیر سرسبز و شادات مربع قطعہ زمین تھا۔ اس پر یہاں وہاں بے ترتیب انداز میں لال، پیلے، سفید، نیلے خودرَو پھول ہری بھری دوب کو آنکھیں مار رہے تھے۔ اس کے گرداگرد چھتارے درختوں کے جھنڈ جیسے ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اُن کے سائے میں قلقل بہتی ندی اپنی تہہ میں پڑے ہوئے رنگارنگ سنگ ریزوں کو چھپائے نہیں چھپا پا رہی تھی۔ طائرانِ زرّیں منقار و رنگین بدن درختوں پر چہلیں کرتے ہوئے زمزمہ سرا تھے۔ میدان کے بالکل وسط میں قطار اندر قطار درباری طرز کی کرسیوں پر جُبہ و دستار اور دراز ریش والے عمائدینِ شہر جلال و تمکنت سے تشریف فرما تھے۔ ان کے سامنے ایک بڑا اور بلند پنڈال آراستہ و پیراستہ تھا جس پر شاہی میز کے پیچھے رکھی ہوئی زرنگار کرسی اپنے خصوصی مہمان کے انتظار میں سراپا بصارت بنی ہوئی تھی۔ اتنے میں مشرق کے پہاڑوں

سے ایک بلند قامت شخص نمودار ہو جس نے کریم کلر سوٹ پہنا تھا۔ اس کے سر کے بال چونکہ رخصت ہو رہے تھے، اس لئے ماتھا کافی فراخ لگ رہا تھا۔ گورے چہرے پر دھری ستواں ناک کے دائیں طرف ایک بڑا سا کالا مسّا کہہ رہا تھا کہ وہ قسمت کا دھنی ہوگا۔ وہ رعونت سے چلتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھا تو سبھی کھڑے ہونے والے مدعو مہمان بھی بیٹھ گئے۔ اتنے میں شمال کے پہاڑوں سے درمیانہ قد کا ایک گول مٹول سانولا سا آدمی سرمئی سوٹ پر رنگین نکٹائی باندھے اپنے گھنے بالوں کی ترچھی مانگ سے کھیلتا ہوا اور بے خیالی میں اپنے چیچک زدہ چہرے پر بایاں ہاتھ پھیرتا ہوا ظاہر ہوا۔ وہ جوں ہی زمین پر اُترا تو سیدھا اول الذکر شخص کے پاس گیا اور اس کے قدموں میں ننگے فرش پر فرماں بردار غلاموں کی طرح دو زانو بیٹھ گیا۔ پھر جیسے مجلس میں جان پڑ گئی جب اناؤنسر نے مائیک پر اعلان کیا......" آپ لوگ جانتے ہیں کہ کل ہمارے یہاں سے "دلشتم پشتم" زبان کا ایک باقاعدہ پروگرام شروع ہونے والا ہے۔ اس پروگرام کا افتتاح آج ہمارے رئیس جناب منجدھار شرقی کے نامبارک ہاتھوں سے ہو رہا ہے۔ میں اُن سے گزارش کروں گا کہ وہ قوم پر احسانِ عظیم کر کے کرسی صُدارت کو شرفِ ہمنشینی عطا فرمائیں!"۔

غلط محاورہ

تالیوں سے میدان گونج اٹھا اور زرّیں منقار پرندے پر پھڑ پھڑا کر وحشت زدہ ہو گئے۔ جناب منجھار شرقی کھڑے ہو گئے۔ سفید عمامہ پہنے ہوئے لمبی شرعی داڑھی والے ایک بزرگ نے طلائی تھال میں رکھی ہوئی طرہ دار پگڑی اُٹھائی اور اس کے سر پر رکھی۔ اس کے قدموں میں بیٹھے ہوئے اس کے نائب نے پگڑی کا زمین کو چھوتا ہوا شملہ اپنے بھرے بھرے ہاتھوں میں سنبھال لیا اور پیچھے پیچھے چل دئے۔ جب وہ کرسی صُدارت سنبھالتے ہوئے بیٹھ گئے تو شملہ بدستور اس کے عقب میں کھڑے اس کے نائب جناب اُجاڑ صاحب شمالی کے ہاتھوں میں ہی رہا

تقریب کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ جب تلاوت ختم ہو چکی اور سبھی

حاضرین وناظرین اپنے ہاتھ چہروں پر پھیر چکے تو پنڈال کے ایک طرف کا پردہ اُٹھا اور کلغی دار پگڑیاں باندھے قمیص شلواروں میں ملبّس مغنّیوں کی ایک جماعت باجے، رباب، مردِنگ، طبلے سنبھالتی ہوئی ظاہر ہوئی۔ انہوں نے بیٹھ کر "لشتم پشتم" زبان کا کوئی گیت ایسے وجد آفرین انداز میں جھوم جھوم کے گایا کہ سامعین وناظرین اپنے پاؤں کو حرکت دیتے ہوئے ہاتھوں سے تال دینے لگے۔ اُجاڑ صاحب شمالی ایسے وارفتہ ہوگئے کہ انہوں نے اپنے آقا کی طرہ دار دستار پر ایک دھپ جمائی جس پر آقا نے اسے گھوم کر خمار آلودہ نظروں سے دیکھا اور وہ معذرت خواہانہ انداز میں "معاف کیجئے غلطی ہوگئی" کہتا ہوا آب آب ہوگیا۔ گیت ختم ہوا تو ناظرین تالیاں بجاتے ہوئے کھڑے ہوگئے اور بڑی دیر تک واہ واہ کی۔ جب شور تھما اور مغنّیوں کی پارٹی جا چکی تو اناؤنسر نے فرمایا "حضرات وخواتین! دونوں ہاتھوں سے دل تھام کے بیٹھئے۔ اب وہ "روف" گیت پیش کیا جائے گا جسے سن کر بوڑھے جوان اور فرزانے دیوانے بن جاتے ہیں۔ میری مراد دُخترانِ کشمیر کے اس "روف" سے ہے جس کے بول یہ ہیں۔

بومبرو بومبرو شامہ رنگہ بومبرو......

یہ سن کر حاضرین بے حال ہوگئے اور ہوٹنگ کرتے ہوئے، سیٹیاں تالیاں بجاتے ہوئے کھڑے ہوگئے اور "روف" سننے سے پہلے ہی اس قدر وجد میں آگئے کہ کئی صاحبان کی پگڑیاں سروں سے لڑھک گئیں۔ بڑی دیر کے بعد جب خاموشی چھاگئی تو ہر طرف رنگا رنگ "تلہ دار پھرن" اور لال، پیلی، ہری نیلی اوڑھیاں اور سفید شلواریں ناچنے لگیں۔ "روف" فضاء میں گونج اٹھا۔ پس منظر کی موسیقی نے اس کے بولوں میں شرابِ ارغوانی گھول دی۔ پھر عمامے پیتے رہے، شرعی داڑھیاں پیتی رہیں، جبے پیتے رہے، کان پیتے رہے، آنکھیں پیتی رہیں اور پھر وہ ایسی چڑھی کہ سبھی ہوش کھو کر ایک دوسرے سے لپٹ کر ناچنے لگے اور خیالوں کو چومنے لگے۔ الف نے "ب" کے ماتھے کو، "ب" نے "ج" کے رخساروں کو اور اُجاڑ صاحب شمالی نے

اوڑھنیا

منجدھار صاحب شرقی کے کالے تل کو چوم لیا اور تان لگا دی ''اوئے، گورے گورے گال پہ کالا تل کیوں من کو بھائے''؟ جواب میں منجدھار صاحب نے اُس کے گال پر ایک بھاری تھپڑ رسید کیا جس پر انہوں نے حسبِ معمول معذرت چاہی ''معاف کیجئے جناب غلطی ہوگئی، میں دراصل آپ کو فلم ہیروئن مالا سنہا سمجھا تھا!!''...... جب ''روف'' ختم ہوا اور دخترانِ کشمیر کی پارٹی رخصت ہوئی تو حاضرین کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ وہ اپنی عرق آلود پیشانیوں کو دستی رومالوں سے پونچھتے ہوئے، زوردار تالیاں بجاتے اور داد دیتے رہے یہاں تک کہ ان کی پگڑیاں اور داڑھیاں باہم الجھ گئیں...... پھر منجدھار صاحب شرقی اپنی صدارتی تقریر کے لئے کھڑے ہوگئے۔ اپنی تقریر کے آخر میں انہوں نے فرمایا''........... یہ بلاشبہ اس قوم کی نیک بختی ہے کہ ہم نے لشتم پشتم زبان میں اپنے پروگراموں کا آغاز کیا۔ یہ دراصل ہماری اُن روایتوں کی آبیاری ہے جن کی بنیاد یہاں اولیائے کرام اور رشیوں منیوں نے ڈالی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ پروگرام نہ صرف ہماری گم گشتہ روایات وتمدن کی بازیافت میں مددگار ہوگا بلکہ انہیں ترقی دینے میں بھی اہم رول ادا کرے گا!''۔

سارا قطعۂ زمین ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ صاحب صدر نے ایک بٹن دبا کر پروگرام کا افتتاح کیا۔ حاضرین کو کیا نظر آیا، مجھے یہ نہیں معلوم البتہ میں نے بالکل صاف طور پر دیکھ لیا کہ ''کشمیریت'' نام کا ایک جنازہ جارہا ہے جس کے پیچھے بے پردہ جوان لڑکیاں بے حیائی کا مظاہرہ کرتی ہوئی رونے کے بجائے تھرک تھرک کر گاتی جارہی ہیں ''بومرو بومرو شامہ رنگ بومبرو''۔ زندہ لاشوں کا ایک جم غفیر اپنی لٹتی غیرت کا دیدۂ وا لئے ہوئے نظارہ کرتا جارہا ہے اور بغلیں بجا رہا ہے...... میری آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرات چھلک کر میرے منہ میں آرہے ہے۔ ان کی لذّت سے آشنا ہو کر میں جاگ پڑا اور اپنے آپ کو عرقِ انفعال میں شرابور پایا!!!

⁂

۲۰. اُردو جسے کہیں......

کبھی داغ دہلوی نے کہا تھا۔

اُردو جسے کہیں ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دُھوم ہماری زبان کی ہے

سارے جہاں میں اس کی دھوم ہو یا نہ ہو لیکن حق یہ ہے کہ یہ زبان اپنے اندر بے پناہ حسن رکھتی ہے لیکن اپنے تمام محاسن کے باوجود یہ ہمارے دیس میں اکثر لوگوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ اس کا رسم الخط عربی سے مماثل ہے۔ یہی وجہ اسے مجرموں کی قطار میں کھڑا کر دیتی ہے۔ ویسے زبان کا کوئی مذہب اور دھرم نہیں ہوتا۔ اُردو کا بھی کوئی مذہب نہیں ہے۔ ہوتا، تو گریرسن، جان گل کرائسٹ، پریم چند، کرشن چندر، تلوک چند محروم، رگھوپتی سہائے فراق

گورکھپوری، اوپندر ناتھ اشکؔ، راجندر سنگھ بیدیؔ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ اور جگن ناتھ آزادؔ وغیرہ نے اس زبان کی آبیاری کبھی نہ کی ہوتی۔ لیکن لسانی عصبیت کو کیا کیجئے کہ یار لوگ اسے مسلمانوں کی زبان کہے بغیر نہیں رہتے۔ اب مجبور ہو کے مسلمانوں نے بھی اسے اپنی زبان تسلیم کیا ہے۔ لیکن اُن کا یہ ایجاب وقبول زبانی جمع خرچ سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ مسلمان اس بات سے بے خبر نہیں کہ اس زبان میں ہمارے دین کا نوے فیصد سے زیادہ سرمایہ موجود ہے۔ یہ زبان مٹ گئی تو اُس سرمائے کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنا اور اپنے تمام اوصاف کے ساتھ قبول کرنا بڑا ہی دقّت طلب مسئلہ ہے۔ اُردو ہندوستان کی اکثریت بولتی ہے لیکن تسلیم نہیں کرتی۔ نوّے فیصد سے زیادہ فلمیں اُردو زبان کو برتتی ہیں لیکن اگر وہ اس حقیقت کو دستاویزات میں ظاہر کریں تو انہیں قیامت کی صبح تک ریلیز ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اسی طرح چھوٹے پردے کے تقریباً سبھی سیریل اسی زبان کو وسیلۂ اظہار بناتے ہیں لیکن کوئی بھی اسے سکرپٹ (Script) کے طور پر تسلیم کرنے کا روادار نہیں۔ ریاست جموں وکشمیر میں اسے سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے لیکن یہ ''درجہ'' بھی فقط نام نہاد ہے وگرنہ اکثر وبیشتر سرکاری کام انگریزی میں ہوتے ہیں۔ (اس زبان کو سرکاری زبان کہنا یہاں سرکار کی مجبوری ہے کیونکہ یہ ریاست کے تمام خطوں میں رابطے کی زبان ہے۔) لیکن اب اس ریاست سے بھی اس کا جنازہ نکالنے کے عملی اقدامات ہو رہے ہیں۔ یہاں کشمیری زبان کو پرائمری سطح پر سکولوں میں لاگو کیا جا رہا ہے۔ [یعنی تمام کلاسوں کے لئے لازمی یعنی Coumpulsary بنایا جا چکا ہے]۔ بہت اچھی بات ہے، کیونکہ مادری زبان کو کسی بھی سطح پر نظر انداز کرنا کوئی دانشمندانہ طرزِ عمل نہیں ہے لیکن بدقسمتی سے کچھ لوگ کشمیری زبان کی عمارت کو بہر صورت اُردو کے قبرستان پر ہی تعمیر کرنے پر بضد ہیں۔ اس تصور سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ کشمیری زبان کے

ہمدرد تو نہیں البتہ اُردو کے دشمن ضرور ہیں اور وہ جو کچھ چاہتے اور کرتے ہیں وہ سب حُبِ حسینؑ کے طور پر نہیں بلکہ بغض یزید کے طور پر کیا جاتا ہے......معاف کیجئے، میں سیاست کی طرف جانے لگا اور یہی وہ چیز ہے جو مجھے سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ میں دراصل کہنا یہ چاہتا تھا کہ اُردو بڑی ہی پیاری زبان ہے......ریشم کی ڈوری سے بندھے سنہرے پالنے میں ہمکتے ہوئے گورے چٹے گونگھریالے بالوں والے آہو چشم شیر خوار بچے کی طرح......

اس زبان کو ہر کوئی خواہ مخواہ بول ہی لیتا ہے چاہے اس کے ساتھ اُس کا خواب وخیال میں بھی کوئی واسطہ نہ رہا ہو۔ اس طرح کی اُردو بول چال سے کبھی کبھی نئے نئے اور پیارے پیارے لطائف بھی معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ مثلاً: ایک نوکری پیشہ کشمیری پنڈت جی اپنے دو سکول جانے والے بچوں اور اَن پڑھ بیوی کے ساتھ جموں میں تعینات تھے۔ ایک روز پنڈت جی کھانا کھا کر دفتر اور بچے بغیر کھائے سکول گئے ہوئے تھے۔ پنڈتانی جی ڈیرے پر اکیلی کچن میں مصروف تھی۔ اتنے میں ایک ہمسایہ عورت نے کھڑکی میں سے اُسے یوں پکارا:

”پنڈتانی جی! کھانا وانا کھایا؟“

اُس نے جواب دیا: ”ہاں، پنڈت جی کو کھایا، اب بال بچوں کو کھانا ہے!“۔

پوچھنے والی غیر کشمیری عورت سٹپٹا گئی۔

◆

۲۱. قدموں کا ثبات

اسّی نوّے سال کا واجبی سا تعلیم یافتہ بوڑھا جب استھما کا بھی مریض ہو گیا تو عزیز واقارب اور گھر والوں کے لئے اور بھی بارِ گراں بن گیا۔ ویسے بڑھاپا بذاتِ خود ایک بہت بڑی بیماری ہے لیکن جب اور بیماریاں بھی اس کے ساتھ کسی کی دامن گیر ہو جائیں تو اُس کا مردم بیزار بن جانا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ چنانچہ بڑے میاں بھی مردم بیزار بن گئے کہ بات بے بات دوسروں کو کاٹنے کیلئے دوڑ پڑتے تھے۔ تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق اقرباء نے اس کی پروا کرنا چھوڑ دیا۔ اب وہ تھا، اُس کی بے بسی بے کسی تھی اور اُس کا خدا تھا۔ پھر لوگ اکثر اُسے روتے ہوئے اور مسجد میں اوقاتِ سحر سے بھی پہلے اللہ کے حضور سجدہ ریز دیکھتے۔ بڑے میاں کی دعائیں سن کر لوگ باگ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے: ”لو

جی! بڑے میاں اب سٹھیا گئے ہیں۔ بھلا یہ سٹھیا جانا نہیں تو اور کیا ہے کہ کوئی اس عمر، اس ضعف اور بے بسی و بے کسی کی حالت میں اللہ سے حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کی دعا مانگے۔ اللہ بے شک دعائیں سنتا ہے اور قبول بھی کرتا ہے لیکن ایسی بے سروپا دعا بھی بھلا قبول ہو سکتی ہے!؟ جو شخص دس قدم چلنے پر دَم سنبھالنے کے لئے رُک جاتا ہو، جس کے پاس دوا کی ایک ٹکیہ کے لئے پیسہ نہ ہو، وہ حج کیا کرے گا!؟" لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے رہتے اور بڑے میاں سر جھکائے آنسو بہاتے رہتے!

وہم

پھر اچانک وہ ہوا جس کا کسی کو ہم وگمان بھی نہ تھا۔ معجزہ ہوا...... چمتکار ہوا...... انہونی ہوئی...... بڑے میاں کے پاس راتوں رات شہرت بھی آگئی، عزت بھی آگئی، دولت بھی آگئی اور ان چیزوں کے ساتھ وہ سب چیزیں بھی آگئیں جو لوازماتِ دنیا ہیں...... کار، بنگلہ، عیش و آرام، نوکر چاکر، خدم و حشم وغیرہ وغیرہ۔ جب جناب حج بیت اللہ سے لوٹے تو عشوہ طراز اور نکتہ چیں کہنے لگے "ارے یہ تو بڑا ہی غضب ہوا! کیا تمہیں اُمید تھی کہ اس دنیا میں ایسا بھی ہو سکتا ہے؟...... لیکن اللہ کے پاس کیا عجب ہے! دراصل ہم ہی کم ظرف تھے جو اس کی دعاؤں کا تمسخر اُڑاتے رہے اور ٹھٹھولی کرتے رہے۔ کل تک ہم اس کے ساتھ بات کرنے اور اس کو اپنی محفلوں میں جگہ دینے کے بھی روادار نہ تھے اور آج ہم اس کے دربار میں حاضر ہونے کے لئے سفارشیں لاتے ہیں اور تمنا کرتے ہیں کہ اس کی نظر عنایت ہم پر پڑ جائے!!" یہ سب سن کر ایک نکتہ رس شخص نے کہا:

"بھائیو! اس بڑے میاں کی نہ تو لاٹری لگی اور نہ زمین سے کوئی خزانہ ہی نکلا لیکن پھر بھی یہ صاحبِ ثروت ہو گیا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ اس نے صبر و ثبات اور شکستہ دلی کے ساتھ صرف اُسی سے مانگا جس کے در پر شہنشاہ بھی سوالی ہوتے ہیں۔ یہ مانگتا رہا، مانگتا رہا، مانگتا رہا، یہاں تک کہ دینے والے نے اسے دے دیا۔

اگر یہ اُس کی رحمت سے مایوس ہو کر خاموش رہا ہوتا تو آج اس کی حالت اس طرح کبھی نہ بدلی ہوتی۔ اللہ کا یہ خاصہ ہے کہ وہ کسی کو تو مانگتے ہی دیتا ہے اور کسی کو اس حد تک آزماتا ہے کہ اُس میں اور مایوسی میں ایک بال برابر کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ اگر وہ ثابت قدم رہا تو اللہ اُسے مایوسی کی سرحد سے واپس لا کر اُمید کے سبزہ زاروں میں کھڑا کر دیتا ہے۔ قرآن مجید میں تو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونے کی جگہ جگہ تاکید پائی جاتی ہے۔ لیکن ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

(ترجمہ: اگر دن کو آنکھیں بند رکھنے والا روشنی نہیں دیکھ سکتا تو اس میں چشمۂ آفتاب کا کیا قصور ہے!؟)

(صدفیصد خالص حقیقت پر مبنی واقعہ)

⁂

۲۲. پھوُلن جلتی چِتا

کسی کو اپنی باریک بینی اور ژرف نگاہی پر کتنا ہی ناز کیوں نہ ہو لیکن وہ کسی بھی چیز کو ہرگز اس طرح نہیں دیکھ سکتا جیسی کہ وہ حقیقتاً ہوتی ہے۔ اس کی آسان ترین اور قابل فہم مثال یہ ہے کہ اگر ہم اپنے ہاتھ کے کھلے پنجے ہی کو دیکھ لیں تو ہمیں چار انگلیاں، ایک انگوٹھا، ایک نشیب، چند فراز (Mounts) اور کچھ آڑی ترچھی لکیریں دکھائی دیں گی۔ اس مجموعے کو ہم پنجے یا ہتھیلی کا نام دیں گے۔ لیکن اس مختصر سے ہی مجموعے کا نام ہاتھ کا پنجہ نہیں بلکہ اس میں وہ اسرار ورموز بھی ہیں جن کا مکمل مشاہدہ کسی انتہائی طاقت ور خوردبین سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بقول غالب ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے۔ پرندے چہچہانے لگتے ہیں۔ پھول کھلتے ہیں، مشرق میں سورج اُگتا ہے۔ گھاس پر شبنم کے قطرے جھلمل جھلمل کرنے لگتے ہیں۔ لوگ نیند سے بیدار ہوتے ہیں۔ ہواخوری کرتے ہیں۔ نہاتے دھوتے ہیں۔ ناشتہ کرتے ہیں اور روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ شام کو گھر لوٹتے ہیں۔ کچھ وقت تفریح میں گزارتے ہیں اور لمبی تان کر سو جاتے ہیں۔ جب زندگی مشرق سے پھر نمودار ہوتی ہے تو اُٹھ کر کہتے ہیں کہ نیا دن شروع ہو گیا۔ پھر ایسا کہتے کہتے موسم پر موسم گزرتا ہے اور ایک دن، وہ خوشی سے بے حال ہو کے کہتے ہیں کہ سال گزر گیا۔ پھر اپنے نفع نقصان، ترقی و تنزل اور دخل و خرج کا گوشوارہ تیار کرنے لگتے ہیں۔ پھر اسی طرح کے گوشوارے تیار کرتے کرتے انہیں محسوس ہوتا ہے کہ بہت کچھ حاصل کرنے کے باوجود شاید وہ اُس چیز کو حاصل نہیں کر سکے ہیں جو مطلوب و مقصود تھی۔ پھر وہ یقینی طور سے جان جاتے ہیں کہ یہ دُنیا تو امتحان گاہ تھی اور انہیں مقررہ وقت سے مقررہ وقت تک کے لئے زندگی کا سوالنامہ حل کرنے کے لئے دیا گیا تھا لیکن وہ اسے بازیچۂ اطفال سمجھ کر لہو و لعب میں مست رہے۔ اب اس وقتِ مقررہ کے آخری لمحوں میں ممتحن کے کارندے اُن کی طرف آہستہ آہستہ لیکن استقامت سے بڑھ رہے ہیں۔ نگراں عملے کا سربراہ اونچی آواز میں کہتا ہے: "Time is over."

اس کے ساتھ ہی کارندے جوابنامہ (Answer -Sheet) اُن کے ہاتھ سے چھین لیتے ہیں۔ وہ گڑگڑاتے ہیں، منت سماجت کرتے ہیں کہ انہیں بس چند لمحے اور دیے جائیں تاکہ وہ کم سے کم ایک ہی سوال کا ایک ہی پارٹ (حصہ) حل کر سکیں۔ لیکن وہ کارندے جس نظام کے ساتھ منسلک اور وابستہ ہوتے ہیں، اُس کے اصول اٹل، حتمی اور ناقابل تنسیخ ہوتے ہیں۔ وہ بورڈ آف سکول ایجوکیشن کے کارندے نہیں ہوتے جو اپنے مفادات کے لئے اصولوں او

رضا بطوں کو ٹکے سیر کے بھاؤ فروخت کرتے ہیں۔ پھر وہ حکیم منظور کی آواز میں اقرار کرنے لگتے ہیں۔

باز یچۂ اطفال نہیں ہے دُنیا
اک حال ہے بے حال نہیں ہے دُنیا
جینا ہے آسان پرکھنا مشکل
تقویم مہ و سال نہیں ہے دُنیا

یہ دُنیا ہے تو بڑی چمکیلی اور بھڑکیلی لیکن اس کی اصل میں پوٹاشیم سائنائڈ سے بھی زیادہ مہلک زہر بھرا ہوا ہے۔ ذرا سی چوک کیا ہوئی کہ انسان اس کا شکار ہوا اور پھر پانی بھی نہ مانگ سکا۔ یہ ہے تو جلتی چِتا جو دن رات انسانوں کو ہڑپ کرتی رہتی ہے لیکن لگتی گلنار پھولوں کی بغیا ہے جس میں رنگ ہے، روپ ہے، جوبن ہے، کشش ہے اور کیا کچھ نہیں ہے۔ بقول حبیب پینٹر قوال۔

پھولن جلتی چِتا ہے دُنیا دوزخ کی پگڈنڈی ہے
اس پر دھوکا کبھی نہ کھانا ہر پہلو سے گندی ہے

◆

۲۳۔ تقاضے، انسانیت کے

میں

قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ ”میں نے جنوں اور انسانوں کو فقط اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں“۔ عبادت کا لفظ اپنے اندر ایک بہت ہی وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس لئے اسے زبان سے اللہ اللہ کرنے اور چلّے کھینچنے تک ہی محدود نہیں کیا جا سکتا۔ بقول علامہ اقبال ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

دردِ دل یعنی دردمندی عبادت کی روح ہے اور جو عبادت دردمندی سے عاری ہو وہ بہت زیادہ وزن دار نہیں ہو سکتی۔

انسان اعلیٰ ترین صفات اور صلاحیتوں سے متصف ہونے کے باوجود

کی

اول جو

اصل میں انتہائی کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ دورانِ حیات میں جب کبھی یہ ازلی اور ابدی کمزوری اس پر غالب آجاتی ہے تو یہ دنیا کا سب سے قابلِ رحم مخلوق بن جاتا ہے۔ محض ایک معمولی حادثہ عرش کی باتیں کرنے والے کو فرش پر لٹا دیتا ہے۔ محض ایک نس کا متاثر ہو جانا دانائے دہر قسم کے شخص کو اول جلول بکنے والا پاگل بنا دیتا ہے۔ دورِ حاضر میں تو ایک انسان کی یہ کمزوری اپنی تمام تر کراہتوں کے ساتھ منصۂ شہود پر آگئی ہے...... ایک بھرا پُرا گھر، ایک ہنستا کھیلتا پریوار دم زدن میں لٹ جاتا ہے، بکھر جاتا ہے اور سریلے نغموں کی جگہ آہ وفغاں اور چیخ وپکار لے لیتی ہے۔ کوئی بے سہارا ہو جاتا ہے، کوئی یتیم اور کوئی بیوہ! ایسے حالات میں انسان کے دل کی دردمندی اور زیادہ اہمیت اختیار کرتی ہے۔ اگرچہ آج ہم حادثات کے تسلسل کی وجہ سے اس کے عادی ہو کر محض اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرنے لگے ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اپنی سوسائٹی اور معاشرے کی ذمہ داریوں سے بری ہوگئے ہیں۔ سوسائٹی کے افراد ایک دوسرے کے لئے سالموں (Molecules) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب ایک سالمہ دوسرے کو اور دوسرا تیسرے کو تھامے رکھے تو معاشرے کا ڈھانچہ ایستادہ رہ سکتا ہے۔ یہ بکھر گئے تو ڈھانچہ بھی بکھر جائے گا۔ اس طرح سے کوئی بھی سالمہ من حیثیت الذات زندہ اور قائم نہیں رہ سکتا۔ اپنے لئے جینے اور محض اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرنا حیوانی طرز عمل ہے۔ اصطبل یا گاؤ خانے میں آگ لگتی ہے تو ہر جانور اپنے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور جس کے جہاں سینگ سماتے ہیں، پناہ لیتا ہے۔ لیکن جب انسانی گھروں میں آگ لگتی ہے تو ماں بچے کے لئے، باپ بیٹے کے لئے، بہن بھائی کے لئے، دوست دوست کے لئے، ہمسایہ ہمسائے کے لئے، مسلمان غیر مسلم کے لئے اور غیر مسلم مسلمان کے لئے کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر دہکتی آگ میں کود پڑتا ہے۔ یہ اس بات کا منہ بولتا عندیہ ہے کہ انسان کو صرف اپنی ذات کے

خول میں بند رہ کر جینے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کی غرض وغایت پر غور کرنے کی زحمت اٹھائے اور اپنی ذات پر دوسروں کے حقوق کو عملاً تسلیم کرے تو اسے وہ مسرت اور خوشی حاصل ہوگی جو اس فانی دنیا میں شدّاد کے طرز کی جنت تعمیر کر کے بھی نہیں ہو سکتی۔ بقول شاعر ؎

ہم تو انساں ہیں گرتے ہیں سنبھلتے ہیں
اور جو گرتوں کو سنبھالے وہ خدا ہوتا ہے

◆

۲۴. سیکھنا سکھانا

سیکھنے سکھانے کا عمل بہت ہی دِقّت طلب ہے۔ سیکھنے والے کو سیکھنے کی تڑپ نہ ہو تو وہ کامل بن ہی نہیں سکتا۔ لیکن اس کے باوجود کچھ لوگ اِدھر اُدھر ٹھونگیں مار کر کچھ نہ کچھ جمع کر ہی لیتے ہیں اور خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ دوسرے کو سکھانا ایک بہت ہی بڑے دل گردے اور ظرف کا متقاضی ہوتا ہے۔ اکثر لوگ دوسرے کو کوئی بھی بات سکھانے سے پہلے اس وسوسے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اُس کی سکھائی ہوئی بات کہیں اُس کو گرانے اور پچھاڑنے کا سبب نہ بن جائے۔ بقول شیخ سعدیؒ ؎

کس نیا موخت علمِ تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

(ترجمہ: جس کسی نے بھی مجھ سے تیر چلانے کا علم سیکھا، اُس نے آخر کار مجھے ہی نشانہ بنایا۔)

فی الواقع مجھے اس کا تجربہ ہے کہ کم ظرف لوگ اُستاد ہی کے خلاف اُس سے سیکھی ہوئی باتوں کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ''علم'' کا تعلق ہے، اِسے ان خدشوں اور اندیشوں سے بالاتر ہو کے سکھایا جانا چاہئے۔ یہ پیغمبروں کی میراث ہے اور اس کے حامل کو اسے تہہ خانوں میں محفوظ کرنے کے بجائے فراخدلی سے بانٹتے رہنا چاہئے۔ یہ دنیا کی وہ چیز ہے جو بانٹنے سے گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی ہے۔

مجھے بہت مدت تک ''افسانے'' اور ''خاکے'' کا فرق معلوم نہیں تھا۔ میں نے اس فرق کو جاننے کے لئے اپنے دائرۂ اثر ونفوذ میں بہت سر کھپایا لیکن بے سود۔ اتفاق سے ایک دن ایک ڈاکٹر صاحب (پی ایچ ڈی) نے محفل میں یہ ذکر چھیڑ دیا۔ میرے کان کھڑے ہوگئے اور میں نے انتہائی عاجزی اور لجاجت سے انہیں وضاحت کرنے کے لئے کہا۔ میرے جذب وشوق کو بھانپ کر وہ صاف کنی کترا گئے اور بات کو گول کر کے نو دو گیارہ ہوگئے۔ واقعہ یہ نہیں تھا کہ وہ افسانے اور خاکے کے فرق کو نہیں جانتے تھے بلکہ وہ مجھے سکھانا نہیں چاہتے تھے۔ شاید ان کے لاشعور میں یہ بات رہی ہوگی کہ میں ان سے ایک بات سیکھ کر ان کا حریف نہ بن جاؤں اور کہیں کسی وقت اُن کے مقابلے میں میدان نہ مارلوں۔ میرا حالانکہ یہ طریقہ ہے کہ میں جس سے بھی کوئی بات سیکھتا ہوں، اُسے اپنے اوپر احسان تصوِر اُس کا
کرتا ہوں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ ''احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا''۔ مجھے ایک لفظ کے مفاہیم کی پورے اُنیس برس تلاش رہی اور ایک روز حادثاتی طور پر مرحوم ومغفور پروفیسر محی الدین حاجنیؔ صاحب کی برکت سے وہ تلاش اپنے اختتام کو پہنچی۔ مجھے آج بھی افسوس ہے کہ میں اُن کا وہ احسان نہ اُتار سکا۔

اصولاً ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں اپنی محدود علمی کمائی کو دوسروں تک منتقل کرنے میں بخل برتتا کیونکہ جب یار لوگ میرے معاملے میں ”قارون“ بن گئے تو میں ”حاتم طائی“ بنا کیوں پھروں!؟ لیکن میں ایسا نہیں کرتا۔ شاید اس لئے کہ علم کو پھیلانے اور عام کرنے کی اسلام میں بڑی زوردار تاکید آئی ہے اور میں اس تاکید کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پاتا ہوں۔ سیکھنے سکھانے کے سلسلے میں کسی کو زیادہ ہی وسوسہ لاحق ہو تو اسے یہ چھوٹی سی کہانی یاد رکھنا چاہئے کہ اپنے وقت میں ”رستم زماں“ کہلوانے والے ایک بوڑھے پہلوان نے ایک خاص شاگرد کو کشتی لڑنے کے فن میں اتنا ماہر بنا دیا کہ وہ بڑے بڑوں کی چھٹی کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شہرت اور دبدبے کا ڈنکا ہر طرف بجنے لگا۔ شاگرد پہلوان شہرت کی بھنگ پی کر اتنا بدمست ہو گیا کہ ایک دن اپنے ہی استاد کو دعوتِ مبازرت دے ڈالی۔ بوڑھا پہلوان پہلے تو بہت کسمسایا لیکن جب اُس کی عزت پر بن آئی تو اس نے مقابلے کی دعوت قبول کر ہی لی۔ سارا شہر کشتی دیکھنے کے لئے اُمنڈ پڑا۔ جب دونوں پہلوان اکھاڑے میں آ گئے اور ایک دوسرے سے پنجہ لڑایا تو تماش بینوں نے حیرت سے دیکھا کہ بوڑھے پہلوان نے نہ جانے کیا کیا کہ شاگرد پہلوان ایک ہی جھٹکے میں چاروں شانے چت ہو گیا۔ جب وہ دھول جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا تو شرمندگی کا پسینہ پونچھتے ہوئے استاد پہلوان سے پوچھا: ”استاد جی! آپ نے یہ کون سا داؤ استعمال کیا کہ میرے گرنے کی خبر مجھے بھی نہیں ہوئی!؟“ استاد نے جواب دیا: ”بیٹا! بس یہی ایک داؤ میں نے بچا کے رکھا تھا اور تمہیں نہیں سکھایا تھا۔ اگر سکھایا ہوتا تو آج میری تمام شہرت مٹی میں مل چکی ہوتی کیونکہ ”شاگردِ نارشید“ ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں!“۔

بے محل

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے رہیں چراغ
رستے میں چاہے دوست یا دشمن کا گھر ملے

* * *

۲۵. داخلہ ممنوع نہیں

ایک جیّد عالم نے کچھ اس طرح لکھا ہے کہ ایک روز کسی نوجوان نے ایک ضعیف العمر شخص سے کہا: ”...... بڑے میاں! قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو، اس کے باوجود فکر آخرت نہیں کرتے!“ بظاہر یہ ایک معمولی بات ہے کہ ایک نوجوان نے بات کہی اور بزرگ نے سن لی۔ عام آدمی؛ اس کا ذرّہ برابر تاثر بھی نہیں لے گا۔ لیکن مذکورہ عالم نے اس معمولی سی بات میں سے بہت بڑی بات یہ اخذ کر لی ہے کہ ”اس دنیا میں کون ہے جو قبر میں پاؤں لٹکائے نہیں بیٹھا ہے!؟“ ظاہر ہے جب ہر کوئی راہِ فنا کا مسافر ہو اور ہر ذی حیات کے مقدر پر کاتب تقدیر نے موت کی مہر ثبت کر رکھی ہو تو کوئی کس طرح سے کہہ سکتا ہے کہ وہ قبر میں پاؤں لٹکائے نہیں بیٹھا ہے۔ اس لئے معقول اور مناسب بات یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ موت

اپنے ٹھنڈے آہنی پنجے کسی کے حلق پر گاڑھ لے، ہر کوئی اس دنیا کے لئے حتی الوسع کمائی کر لے جو انسان کی آخری اور حتمی جائے قرار ہے کیونکہ فرمانِ نبویؐ کے مطابق دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

لیکن یہ سب جانتے اور مانتے ہوئے بھی نہ جانے کچھ لوگ آخرت کی فکر کرنے کی بجائے فکر نہ کرنے کی صحت کو دلائل و براہین سے ثابت کرنے کے جتن کیوں کرتے ہیں اور کچھ مایوسی کی ردا کیوں اوڑھ لیتے ہیں......؟! دو دن پہلے ایک ڈاکٹر کے مطب کی انتظار گاہ میں میری ملاقات ایک بزرگ سے ہوئی۔ وہ معمولی علیل تھے اور علالت کے لئے شکوہِ سنج تھے۔ میں نے کچھ تسلی دی تو بولے: ”دیکھئے! میری عمر کچھ زیادہ بھی نہیں ہے اور میں موت سے نہیں ڈرتا کیونکہ ہر نفس کو ایک نہ ایک دن موت کا مزہ ضرور چکھنا ہے۔ میں صرف اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میرے پاس عمل کا کوئی ذخیرہ نہیں ہے!“............ میں نے جواب میں کہا: ”جناب! اگر، آپ کے بقول، آپ کے پاس کوئی ذخیرۂ عمل نہیں ہے تو عمل کر کے ذخیرہ پیدا کیجئے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ کوئی صرف ذخیرہ نہ ہونے کی بات کہنے کے بجائے ذخیرہ بنانے کے لئے اقدامات کرے!؟“ میری بات سن کر وہ خاموش رہے اور ذرا وقفے سے بولے۔

کی/کے

عمر گزری عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخری وقت کیا خاک مسلماں ہوں گے

دراصل جب انسان مدتِ عمر کا ایک معتد بہ حصہ کم فہمی اور لااُبالی پن کی وجہ سے عاقبت فراموشی میں گزارتا ہے تو جوانی کا خمار اُترنے کے بعد فکر آخرت سے اس لئے دست کش ہو جاتا ہے کہ ”بھئی! جوانی تو رنگ رلیاں مناتے گزار لی، اب اپنے سفید بالوں کو لے کر درگاہِ مغفرت کے دروازے پر کیا دستک دیں گے!؟“ یعنی۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

لیکن اس درگاہ میں قطعاً مُوسفید کم عمل یا بدعمل بزرگوں کا داخلہ ممنوع نہیں ہے۔ وہاں کوئی بھی کسی بھی وقت آ کے دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔ دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے سخت گیر قوانین پر عمل پیرا ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بس ایک شرط ہے کہ انسان آئے اور بس آ جائے۔ ہاں آنکھوں میں دو آنسو بھی ہوں تو سونے پر سہاگہ ہے۔

ایں درگھہ ما درگاہِ نااُمیدی نیست
اگر صد بار توبہ بشکستی باز آ

(ترجمہ: ہماری یہ درگاہ نااُمیدی کی درگاہ نہیں ہے۔
اگر تم نے سو بار بھی توبہ شکنی کی ہو، پھر بھی لوٹ کے آجاؤ)

◆

۲۶. مورو پلّو لٹکے

روایات میں آتا ہے کہ حضرت شیخ سیّد عبدالقادر جیلانیؒ بڑے ہی نفاست پسند اور خوش پوش واقع ہوئے تھے۔ وہ اکثر قیمتی اور دلکش لباس زیب تن فرماتے۔ ایک بار کسی مرید نے عرض کیا ”یا حضرت! اسلام میں تو سادگی کو پسندیدہ خیال کیا گیا ہے پھر آپ قیمتی لباس کیوں پہنتے ہیں؟“ حضرت نے جواب میں فرمایا:

”برخوردار! تم قرآنِ مجید کے لئے کس قسم کا غلاف پسند کرتے ہو، معمولی یا قیمتی!؟“

”قیمتی، یا حضرت!“۔

”تو پھر جان لو کہ مجھ میں چونکہ قرآن مجید نے گھر کر لیا ہے، اس لئے میرا لباس بھی پسندیدہ اور قیمتی ہی ہونا چاہئے!“۔

بلاشک وریب ایک عالمِ دین کا لباس بہت ہی نفیس وجلیل ہونا چاہیئے تاکہ اس کے علم وفضل کی قدر عوام الناس کے دلوں میں اور بڑھ جائے۔ عالم دین کوئی معمولی چیز نہیں ہوتا۔ علماء کو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''پیغمبروں کے وارث'' قرار دیا ہے۔ لیکن اگر کوئی علم وفضل کی قدر وقیمت بڑھانے کے بجائے اپنے آپ کو منفرد وممتاز بنانے کیلئے قیمتی کپڑوں کا استعمال کرے تو میرے خیال میں یہ کوشش اُس کو تکبر کی راہ پر ڈالتی ہے اور تکبر اسلام میں ہر لحاظ سے مذموم ہے۔

ایک عالم دین حج سے لوٹے اور کوئی دو ماہ تک خانہ نشین رہے کیونکہ ''بدعتِ حسن'' کے طور پر وہ گھر پر رہنے اور عوام وخواص کو شرفِ ملاقات بخشنے پر مجبور تھے۔ (کیا کیا جائے، آج کوئی سفر محمود پر جانے سے اتنا نہیں گھبراتا جتنا وہ اس سفر سے پہلے اور بعد میں لوگوں سے پیہم ومسلسل ملنے اور گلے ملنے سے گھبراتا ہے۔ کوئی مروّت کی وجہ سے اس ''ضیق النفس'' کا اقرار نہ کرے تو بات الگ ہے)۔ جب دو ماہ بعد انہوں نے باہر کی کھلی ہوا سونگھی اور مجھے انہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تو میں دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ حج کرنے سے پہلے وہ سفید سوزنی ٹوپی، سفید کرتا پاجامہ، بند گلے والی کالی صدری پہنتے تھے۔ سردیوں میں اس پر بنیان، پھرن کا اضافہ کرتے تھے۔ اس لباس میں وہ مجھے بڑے ہی پیارے لگتے تھے۔ اس بار اُن کی ہیئت کذائی اس طرح تھی:...... سر پر شملے طرّے والی مائل بہ آسمان سفید براق پگڑی، سبز رنگ کا زمین کو چھوتا ہوا ایک لا ثانی گریباں والا لمبا پھیلا ہوا چوغہ اور چوغے کے اوپر دائیں کاندھے میں پھنسی اور بائیں بازو کی بغل سے نکلتی ہائی کورٹ وکیلوں کی طرز می پلّو لٹکاتی ہوئی سفید پوسٹر کی لہراتی لمبی چادر...... یا حیرت! اس کایا پلٹ کی وجہ!؟ حج کرنے کے بعد تو مسلمان کے کردار مین انقلاب بپا ہونا چاہیئے لیکن جب تواضع کی جگہ تصنع، عجز وانکسار کی جگہ جاہ وجلال اور حلاوت کی جگہ رعونت نظر آنے لگے تو قبولیتِ حج مشکوک بن جاتی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے وہ

لوک گیت یاد آ گیا جس کے بول کچھ اس طرح ہیں:

پلّو لٹکے مورو پلّو لٹکے

حالانکہ ایک ولی کامل کے ارشاد کے مطابق کسی بزرگ کو دیکھ کر خدا کی یاد آتی ہے!!

⁂

۲۷. آئینہ

غلطی کس سے نہیں ہوتی ؟! جس سے غلطی سرزد نہ ہو جائے وہ یقیناً انسان نہیں فرشتہ ہے کیونکہ غلطی بنی آدم کو ورثے میں ملی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم غلطی کر کے تسلیم نہیں کرتے اور آخری حد تک تمام داؤ پیچ لڑاتے ہیں کہ ہمیں اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرنا پڑے حالانکہ غلطی کو تسلیم کرنا بڑپن کی علامت ہے۔

عیسائیوں کے ہاں ایک رسم ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنی غلطیوں کے اعتراف کیلئے Confession Chambers میں جاتے ہیں اور فادر (Father) کے سامنے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ کنفیشن کا اُن کے مذہب میں کیا فلسفہ اور مقام ہے، اس سے قطع نظر، میرے خیال میں اس کے بعد وہ اپنے آپ کو بہت ہی ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوں گے کیونکہ اپنی غلطیوں کا جب تک کسی کے

سامنے اقرار و اعتراف نہ کیا جائے، من بھاری اور تن بے چین رہتا ہے۔ خدا کے سامنے اپنی کوتاہیوں کو ماننا اتنا اہم نہیں ہے جتنا انسان کے سامنے ماننا ہے کیونکہ خدا بہر صورت کسی بھی انسان کے پوشیدہ اسرار و رموز سے واقف ہوتا ہے۔ اس لئے اعتراف کا کوئی خاص وزن نہیں رہتا۔

حال ہی میں جنوبی افریقہ کی کرکٹ ٹیم کا کپتان Hanse Creujina میچ فکسنگ میں ملوث پایا گیا۔ اُس نے واشگاف الفاظ میں جج لوگوں کے سامنے اعتراف کیا کہ اس سے واقعی یہ غلطی سرزد ہوئی ہے۔ اقبالِ جرم کے اس دلیرانہ فعل نے اُس کے اور اس کے محبوب مشغلے (کرکٹ) کے بیچ ایک ناقابل عبور دیوار کھڑی کر دی۔ اس کا کرکٹ کیرئر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہنسی کرونی بھی اسی کے ساتھ ختم ہو جاتا لیکن عملاً ایسا نہیں ہوا۔ وہ افریقی قوم میں ہیرو کا درجہ حاصل کر گیا اور لوگوں نے اسے ایک عظیم انسان کا درجہ دے دیا کیونکہ بڑے دل والے ہی اپنی غلطیوں کا دلیرانہ طور سے اعتراف کرتے ہیں۔ (ہنسی کرونی بعد میں ایک ہوائی حادثے کا شکار ہوئے)

برصغیر ہندوپاک میں بھی میچ فکسنگ کے سکینڈل طشت از بام ہو گئے۔ کل تک شکتی مان، مہان، بلوان اور بھگوان کہلانے والے کھلاڑی بھی اس حمام میں ننگے پائے گئے۔ بڑے بڑے تفتیشی اداروں نے انکے ننگا ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی لیکن اس کے باوجود ایک بھی کھلاڑی نے اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا۔ سب اپنی اپنی توانائی اور رسائی کے مطابق غلطیوں کو چھپانے کیلئے کوشاں رہے۔ کردار کا یہ تفاوت قومی مزاج کا آئینہ دار ہے اور برصغیر کے باشندوں کو اس آئینے میں اپنی صورت و شبیہ کا بغور جائزہ لینا چاہئے۔ اپنی آنکھ کے شہتیر کو نظر انداز کر کے دوسرے کی آنکھ کے تنکے کو خوردبین سے تلاش کرنا کوئی مستحسن کام نہیں ہے جو ہمارا قومی وطیرہ رہا ہے۔

⁂

۲۸. بے خبر

اُس ذاتِ بے ہمتا کے بغیر کسی کی بھی ذات خالی از علّت نہیں ہے لیکن ہم انسان کو عیوب و علل سے پاک وصاف دیکھنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔ یہ بات پھر بھی چنداں ناگوار نہیں تھی لیکن ہم صرف دوسروں کو پاک وصاف دیکھنا چاہتے ہیں اور اپنے عیوب ونقائص کی طرف ہماری نظریں شاذ ونادر ہی اُٹھتی ہیں۔ جو شخص دوسروں کے عیب تلاش کرنے کے بجائے اپنے عیوب کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے درپے رہےگا وہ نسبتاً ایک بہتر انسان ثابت ہوگا۔

وہ جوڑا بڑا ہی پیارا تھا جیسے آفتاب وماہتاب ! پندرہ سال کی اُن کی ازدواجی رفاقت بہت ہی قابل رشک تھی اور ان کا نام لے کر لوگ مثالیں دیا کرتے تھے۔ بس شوہر ذرا سا نازک مزاج تھا جس کی وجہ سے کبھی کبھی شکر رنجی پیدا

ہوا کرتی تھی وگرنہ زندگی کے سمندر میں ان کی چھوٹی سی ناؤ ہلکے ہلکے ہچکولے کھاتی بڑی ہی آسودگی سے رواں تھی۔

ایک دن انہونی ہوگئی۔ کسی کو بھی یقین نہیں آیا کہ ایسا واقعی ہوسکتا ہے لیکن ایسا ہی ہوا۔ اس لئے بیوی کو بھی یقین کرنا پڑا کہ اسے شوہر نے طلاق دی ہے۔ وہ پتھرا کے رہ گئی۔ کئی ساعتوں کے بعد جب پتھر کے ہونٹ وا ہوئے تو وہ بولے:

''میاں! کیا تم نے مجھے واقعی طلاق دے دی ہے؟؟!

''جی ہاں، دی ہے لیکن بادل ناخواستہ!!''

''بادلِ ناخواستہ ہی سہی، لیکن کیوں؟ اسلام تو ناقابل برداشت حالات ہی میں طلاق کا حق استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے، پھر تم نے اس حق کو اتنی بے دردی سے استعمال کیوں کیا!؟''

''کچھ باتیں صرف کرنے کی ہوتی ہیں، بتانے کی نہیں ہوتیں!''

''جو بات بتانے کی نہیں ہوتی صرف کرنے کی ہوتی ہے اس کی معقولیت ہمیشہ مشکوک رہتی ہے۔ اس لئے میں اس گھر سے اُس وقت تک قدم باہر نہیں نکالوں گی جب تک نہ تم اتنا بڑا فیصلہ لینے کی معقولیت مجھ پر ثابت کرو!''

اس دوٹوک تریاہٹ کے سامنے شوہر یہ کہنے پر مجبور ہوا:

''دیکھو! تم جانتی ہو کہ میں نازک مزاج واقع ہوا ہوں۔ تمہاری ایک بُری صفت کو میں مجبوراً آج تک برداشت کرتا رہا۔ لیکن برداشت کی بھی چونکہ ایک حد ہوتی ہے اس لئے میرا پیمانۂ صبر چھلک پڑا اور میں نے تمہیں طلاق دے دی۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا!''۔

''میں پھر بھی اس بُری صفت کا نام جاننا چاہتی ہوں!''

''وہ بری صفت یہ ہے کہ تم راتوں کو زوردار خراٹے بھرتی ہو اور میری راتیں بے خوابی کا شکار ہو جاتی ہیں!''۔

''اوہ! تو یہ بات ہے۔ اچھا خیر! میں اسی وقت میکے جارہی ہوں لیکن اتنا ضرور بتاتی چلوں گی کہ آج رات کو اپنے سرہانے ٹیپ ریکارڈر رکھ کے سوجانا اور پھر تنہائی میں اپنے فیصلے پر غور کرنا۔ ہوسکتا ہے تمہارا فیصلہ درست ٹھہرے!''۔

پھر وہ شخص رات کو سوگیا۔ بیدار ہونے پر ٹیپ بجایا تو گرجدار خراٹوں سے سارا کمرہ گونج اٹھا۔ پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ اس کے خراٹے تھے لیکن کمرے میں چونکہ اس کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔ اسلئے اُسے ایک تلخ حقیقت کے حنظل کو نگلنا ہی پڑا!!

اُس نے ڈوبے ہوئے سورج کو گلا پھاڑ پھاڑ کے لوٹنے کے لئے پکارا لیکن وہ نہیں لوٹا کیونکہ کہا جاتا ہے سورج صرف قیامت کے روز ہی مغرب سے طلوع ہوگا!!

⁂

۲۹. سویرا

روایات میں وارد ہوا ہے کہ ایک صحابیؓ نے عرض کیا:

”اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں صبح دیر سے جاگتا ہوں، اس لئے نماز باجماعت ادا نہیں کر پاتا۔ کیا کروں؟!“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”دیر سے کیوں جاگتے ہو؟“

عرض کیا: ”حضورؐ! یہ موروثی مرض ہے!“

ارشاد ہوا: ”سویرے جاگنے کی کوشش کرو۔“

عرض کیا: ”حضورؐ! بہت کوشش کر چکا ہوں لیکن ناکامی ہوئی!“

جواب ملا: ”پھر بھی کوشش کرو، کامیاب نہ ہوئے تو جس وقت بھی آنکھ کھلے

،نماز پڑھ لیا کرو لیکن نماز چھوڑو نہیں''۔ اس واقعے سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ انسان کسی بھی کامِ میں بھر پور کوشش کرنے کے لئے مکلّف اور پابند ہے۔ کوئی چیز کوشش کی دسترس سے پرے ہو تو انسان کی ذمہ داری بڑی حد تک کم ہو جاتی ہے۔

میں ایک شخص کو جانتا ہوں۔ اللہ نے اسے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ صحت، مال، دولت، اولاد وغیرہ۔ البتہ عمر رسیدہ ہے۔ عمر رسیدہ ہونا چونکہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں، اس لئے وہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اکثر کہتا رہتا ہے: ''جناب ساری عمر تو گناہوں میں گزری۔ چاہتا ہوں کہ ان آخری ایام میں تائب ہو کر اللہ اللہ کروں، شاید بخشا جاؤں لیکن ایک خیال عزمِ سفر کے آگے سدراہ بن جاتا ہے کہ تمام عمر تو نفس کے بتوں کے سامنے سجدہ ریز رہا، اب کون سا منہ لے کر بارگاہِ مغفرت کے دروازے پر دستک دوں!'' مجھے یقین ہے کہ اسی بزرگ کی طرح اور بھی کئی لوگ ہوں گے جو اپنے ماضی سے خائف، حال سے بے پروا اور مستقبل سے مایوس ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''زمانہ'' ماضی، حال اور مستقبل سے عبارت ہونے کے باوجود فقط ''حال'' کا نام ہے۔ ماضی کو ہم واپس نہیں لاسکتے۔ مستقبل دھندلکوں میں لپٹا ہوا ہے۔ اگر کوئی چیز ایک ٹھوس حقیقت کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے تو وہ ''حال'' ہے۔ حال کو ہم اپنی مرضی اور پسند کے مطابق برت سکتے ہیں۔ اس میں ہم تعمیر بھی کر سکتے ہیں اور تخریب بھی۔ اس لئے ایک فرض شناس اور حقیقت پسند انسان وہی ہے جو اپنے حال کے پیچھے آگے دبیز پردے تان دے تا کہ کبھی ان کے اندر پوشیدہ حوادثات کو دیکھنا بھی چاہے تو نہ دیکھ سکے۔ ماضی کی کوکھ سے ہمیشہ سنہرے یا ڈراونے خواب جنم لیتے ہیں اور یہ بات ہر کوئی جانتا اور تسلیم کرتا ہے کہ حقیقت کی دُنیا میں خوابوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ بس تھوڑی دیر کیلئے انسان کو غیر حقیقی دنیا کے گلستانوں یا خارزاروں کی سیر کرا سکتے ہیں اور احساس کو تھپکیاں دے کر سلا سکتے ہیں لیکن جب ٹھوس دنیا میں

اس کی بازگشت ہوگی تو حقائق کی چٹانوں سے ٹکرا کر لہولہان ہو جائے گا۔ مستقبل بس ایک تصوّر ہے جس کا نہ کوئی محل وقوع ہے اور نہ حدود اربعہ۔ اس لئے اہمیت صرف اُس پل کی ہے جس کے ساتھ سانسوں کی آمد وشد منسلک ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنا خوشگوار نتائج کی حامل ہوسکتی ہے کہ جس وقت بھی آنکھ کھلے وہی سویرا ہوتا ہے۔ اب وہ سویرا کسی دن کے آغاز کا ہے یا زندگی کے کسی مرحلے کا، یہ امر چنداں قابل تجسس نہیں!

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
مدار سارا مگر درمیاں پہ رکھتے ہیں

(عادل منصوری)

◆

۳۰. لہولہو زندگی

ایک نوجوان کے باپ نے اپنے ماتھے کے پسینے سے کھیتوں کو سینچ کر اُسے پڑھایا لکھایا اور ایک دن اُس نے امتیاز کے ساتھ ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ بوڑھے باپ کو لگا کہ اب اُس کے دن یقینی طور سے پھر جائیں گے کیونکر بیٹا سرِکاری نوکر ہو جائے گا تو وہ اپنے کھیت کی مینڈ پر فراغت سے بیٹھ کر رُسلؔ میر اور مہجور کے گیت گاتا ہوا زندگی کا رس نچوڑ کر نوشِ جاں کیا کرے گا۔ لیکن یہ سب دیوانے کا خواب ثابت ہوا۔ بیٹا عرضیوں پر عرضیاں دیتا رہا لیکن اسے نہ تو نوکری ملنا تھی اور نہ ملی۔ پھر نوکریوں کے ایک بچولی نے اُس سے دو لاکھ روپے طلب کر کے نوکری عطا فرمانے کا پکا وعدہ کیا۔ اس نے باپ پر دباؤ ڈال کر اپنی ساری زمین فروخت کروادی اور دو لاکھ کی پوٹلی سب کی نظریں بچا کر بچولی کے ہاتھ میں

تھما دی۔ پھر بچولی غائب ہو گیا، جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ نوجوان نے اسے بہت تلاش کیا لیکن نہ ملا۔ ایک دن شامتِ اعمال سے بھرے بازار میں مل گیا۔ جواں نے نوکری کی بات کی تو وہ آئیں بائیں شائیں کرتا رہا۔ اپنی رقم واپس طلب کی تو صاف مکر گیا۔ جوان کا سرد پڑا ہوا خون جوش کھا گیا اور اس نے بچولی کے گریباں پر ہاتھ ڈال دیا۔ نتیجے کے طور پر حوالات کی ہوا کھانے لگا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اس کے ایک دور کے رشتہ دار کی رگِ حمیّت پھڑک اُٹھی اور تھانے والوں کو کچھ کھلا پلا کر معاملہ رفع دفع کر دیا۔ اس کے بعد اس نوجوان نے بچولیوں کے دروازوں پر جانے سے توبہ کی۔

پھر اُس نے نوکری حاصل کرنے کیلئے ایک متبادل طریقہ یہ تلاش کیا کہ ایک وزیر کے حاشیہ بردار کے برادرِ نسبتی کا جی حضوری بن گیا۔ کئی سال اس کی اتنی خدمت کی کہ کسی مرید نے اپنے پیر کی کیا کی ہوگی۔ قریب تھا کہ وہ حضرت اُس پر مہرباں ہو جاتے کہ حاشیہ بردار کو کسی نامعلوم بندوق بردار نے گولی مار کر ملک عدم کی طرف کوچ کرنے پر مجبور کیا۔ چونکہ بانس کے بغیر بانسری نہیں بجتی، اسلئے نوجوان نے منہ لٹکا کر گھر کی راہ لی اور خانہ نشین ہو گیا۔ لیکن شاعر نے کہا ہے ع

ہم نے مانا کہ دلّی میں رہیں گے پر کھائیں گے کیا

اس لئے جب تک وہ گھر پر رہا، فاقہ مست ہی رہا اور اس پر طرہ یہ کہ باپ بھی وقت کے کچھوکے نہ سہار کر چل بسا۔ نوجوان حواس باختہ ہو گیا جسے یار لوگوں نے فرسٹریشن (Frustration) کا نام دیا۔ اس فرسٹریٹیڈ نوجوان کے کان میں کسی نے یہ بھنک ڈال دی کہ سرکار ”خود روزگار سکیم“ (Self Employment Scheme) کے تحت پڑھے لکھے بے روزگار نوجوانوں کو بنکوں سے لون (Loan) فراہم کرتی ہے جس سے انہیں جینے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ اندھا کیا چاہے دو دو آنکھیں! وہ دوڑتا ہوا گیا اور کئی طرح کے فارم حاصل کر لئے۔ انہیں پُر کیا

اور ایک دفتر سے دوسرے دفتر کی راہ ناپنے لگا۔ سڑکوں کی کافی پیمائش کرنے کے بعد ایک دن اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ ملازموں کی جیبیں گرم کرتے کرتے اپنی اس پس انداز کی ہوئی رقم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا ہے جو اسکے محلے داروں نے اس کے باپ کی رسم چہار پر جمع کر کے اسے دی تھی۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ کل اُسے اپنے کاغذات کی حتمی تکمیل کے لئے سرینگر جانا تھا اور اس کی جیب خالی تھی۔ اس نے کرائے کے لئے چالیس روپلی کے پیسے کئی لوگوں سے مانگ لئے لیکن سبھی نے انکار کیا یا بہانہ بنایا کیونکہ اس کے متعلق اب یہ افواہ بھی پھیل چکی تھی وہ کبھی کبھی چرس گانجے سے بھی شغل کرنے لگا ہے۔ اور جو چرس گانجے کی لت کا شکار ہو گیا ہو اُسے کوئی بھی ''بھائی جان'' نہیں بلکہ ''چرسی'' ہی کہتا ہے۔ یہ بات بہت ہی واضح ہے کہ چرسی کو قرض دینے کے روادار لوگ ہماری سرزمین پر نہیں پائے جاتے۔ اس نے رونے کی بہت کوشش کی لیکن نہ رو سکا کیونکہ یہ بھی کہا اور سنا جاتا ہے کہ آنسو یا تو مصیبت کے ماروں کے خشک ہو جاتے ہیں یا چرسیوں کے! پھر اُسے ایک ترکیب سوجھی کہ غیرت اور حمیت کو ایک لمحے کے لئے نظر انداز کیا اور ایک قراقلی والے حاجی صاحب اور نکٹائی والے بابو کے سامنے دست سوال دراز کیا۔ نکٹائی والے بابو نے اسے ڈانٹ پلائی ''ابے او بے شرم! اتنے ہٹے کٹے مشٹنڈے ہو کر بھیک مانگتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی ؟! جا دفع ہو جا اور محنت مزدوری کر۔ تم جیسے لوگوں ہی نے تو اس قوم کی مٹی پلید کر دی!'' قراقلی والے حاجی صاحب کو رحم آ گیا اور بیس کا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ یکطرفہ کرایہ ملنے کی خوشی میں اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے لیکن اس نے انہیں پی لیا اور سرینگر کی طرف روانہ ہوا۔ دو گھنٹے کے بعد جب وہ سرینگر میں ''بٹہ مالو'' بس اسٹاپ پر اترا تو ایک گرنیڈ دھماکے سے اسکی دنیا تہہ و بالا ہو گئی۔ جب ''برزلہ'' کے بون اینڈ جوائنٹ ہسپتال کے بیڈ پر اسے ہوش آیا تو اس کے لون کے کاغذات اس کی پتلون کے

ہپ پاکٹ میں موجود تھے البتہ ایک ٹانگ غائب تھی۔ پھر وہ بہت رویا، زار وقطار رویا، یہاں تک کہ اس کی گگھی بندھ گئی۔ کسی بیمار کی مزاج پرسی پر آئے ہوئے ایک درد آشنا شخص نے ہمدردی سے پوچھا: ''کیوں بیٹا! چوٹ زیادہ گہری ہے کیا؟!''

اُس نے آنسوؤں میں تر بتر زبان سے بس یہ شعر کہا۔

زندگی ہے لہو لہو اور تم
چوٹ کھانے کی بات کرتے ہو

(ممتاز نکہت)

* * *

۳۱. ایک مُٹھی ریت

دُنیا بدل گئی اور بدل رہی ہے۔ کل جو ”پُلہ ہورُ[1]“ پہنتا تھا آج رنگا رنگ جوتے پہنتا ہے۔ جو ”مکایہ[2] واٹھ“ ”پتجی[3]“ پر بیٹھ کر کھاتا تھا، وہ کانتی، کباب (۴) ”رستہ و گوشتابہ“ میز کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے تناول فرماتا ہے جو دردِ سر میں زنجبیل اور پسی ہوئی مرچ کا پیشانی پر لیپ کرتا تھا وہ اُسی درد کے لئے اپنا معائینہ ایم آر سی پی ڈاکٹروں سے کرواتا ہے۔ جو گھاس پھوس کی جھونپڑی میں

---

(۱)۔ گھاس سے بنا ہوا مشہور کشمیری جوتا۔

(۲)۔ ابلی ہوئی مکی سے تیار شدہ معمولی غذا۔

(۳)۔ گھاس کی چٹائی۔

(۴)۔ کشمیری وازوان کی کوفتہ گوشت سے تیار شدہ دوسرِ فہرست ڈشز۔

اپنا سر چھپاتا تھا وہ ائرکنڈیشنڈ بنگلوں میں آن بان سے رہتا ہے۔ جو محکوم تھا وہ حاکم ہے۔ جو نوکر تھا وہ آقا ہے۔ جو ''چرخ چوں، چرخ چوں'' کا راگ الاپنے والی بیل گاڑی میں سفر کرتا تھا وہ ائر بسوں میں مسافتیں طے کرتا ہے۔ جو بوج پتر پر ''ناگری قلم'' چلا کر صریرِ خامہ پیدا کرتا تھا وہ نفیس ولطیف کاغذ پر ''ہیرو''، ''پارکر'' اور ''ایڈپین'' چلاتا ہے۔ غرض سب کچھ بدل گیا ہے۔

بس ایک چیز نہیں بدلی ہے...... وہ کل بھی ایک تنگ وتاریک کوٹھری کی محدود دُنیا میں قید تھی اور آج بھی ہے۔ وہ کل بھی ہر فیصلہ پیٹ سے سوچ کر کرتی تھی اور آج بھی کرتی ہے۔ وہ کل بھی ہیروں کو نظرانداز کر کے کنکروں سے اپنا دامن بھرتی تھی اور آج بھی بھرتی ہے۔ وہ کل بھی بات کا بتنگڑ بناتی تھی اور آج بھی بناتی ہے۔ وہ کل بھی انقلابات کی جانی دشمن تھی اور آج بھی ہے۔ ہمارے علمائے کرام کی اکثریت کی سوچ!

ایک عمر رسیدہ شخص چل بسا۔ لوگوں کے ایک جم غفیر نے اُسے کاندھا دیا اور خلوص ومحبت سے اُس کی تجہیز وتکفین کی۔ آج کے دور میں جو شخص زندگی کی ایک قابلِ لحاظ مدت پوری کر کے طبعی موت مرے، عزیز واقارب حق ہمسائے اُسے نالہ وشیون اور افسوس وواویلا کے بغیر اس طرح سپردِ خاک کریں کہ اُس کا کفن خون آلود نہ ہو، وہ بڑا ہی قسمت والا ہے۔ وہ شخص بھی قسمت والا ہی تھا لیکن زمین کے اوپر قیام پذیر مُردوں کے درمیان پھر بھی اُس کی ''رسم چہارم'' کو لے کر ایک نزاع پیدا ہوگئی۔ ہوا یوں کہ ایک نئے نئے فارغ التحصیل نوجوان مولوی صاحب نے ''رسم چہارم'' کو ''بدعت'' ٹھہرایا اور عوام الناس سے اپیل کی کہ وہ اس بدعت اور اس سے ملتی جلتی دوسری بدعتوں کا قلع قمع کرنے کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ یہ بھنک پرانے امام صاحبان کو ملی تو انہوں نے علمِ مخالفت بلند کیا اور صلاح مشورے کے بعد اپنے معتقدین ومقلدین کو یہ باور کرایا کہ رسم چہارم اگر بدعت

ہے لیکن ''بدعت حسنہ'' ہے اوراس بدعت کی سرزمین اسلام پر آبیاری کی جانی چاہئے نہ کہ بیخ کنی! انہوں نے علی الاعلان عوام کے اجتماعات سے خطاب فرمایا: ''لوگوں! رسولِ کریمؐ نے ہر اُس چیز کو بدعت قرار دیا ہے جو اصل اور حقیقی اسلام پر اضافہ ہو۔ بے شک رسمِ چہارم بھی اراکین اسلام میں ایک اضافہ ہی ہے لیکن اضافۂ حسنہ ہے جو کسی بھی صورت میں ممنوع نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ اضافہ ممنوع ہوسکتا ہے تو پھر قرآن مجید کی شیرازہ بندی اور جِلد بندی بھی ایک بدعت ہی ہے کیونکہ قرآن مجید کے اوراق نبیؐ کے وقت میں منتشر حالت میں تھے۔ نبیؐ کے وقت میں مسجد نبوی کا فرش ننگا اور ریتیلا ہوتا تھا لیکن آج وہی فرش اور دوسری مساجد کے فرش صاف وشفاف، چکنے اور قالینوں سے مزّین ہوتے ہیں۔ حضورؐ کے زمانے میں نسبتاً مرتفع جگہوں سے اذان دی جاتی تھی لیکن آج وہی اذان لاوڈ سپیکروں پر دی جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب یہ سب اضافے ''بدعت'' نہیں ہیں تو ''بے چاری رسمِ چہارم'' بدعت کیوں ٹھہرنے لگی جس میں صاحبِ میّت کچھ کھان مان کا انتظام کرتا ہے، ختم قرآن اور درود واذکار کا اہتمام کرتا ہے اور میّت کے لئے ایصالِ ثواب ہوتا ہے۔ ہماری مانو تو ان مفتن نام نہاد مولویوں کو دیس سے ہی نکال دو تاکہ فتنہ فساد کی جڑ کٹ جائے اور لوگ اپنی اُن رسومات کو گلے سے لگائے رکھیں جو ہمارے اسلاف کو جان سے زیادہ عزیز رہی ہیں!'' پھر اُس صاحبِ میت نے دھوم دھڑاکے کا ''وازہ وان'' پکایا۔ مولوی صاحبان نے رقّت آمیز لہجے میں تلاوت کلام پاک کی اور نظمیں وغزلیں پڑھ کر سماں باندھ دیا۔ پھر وازہ وان کھا کر رُخصت ہونے ہی کو تھے کہ صاحبِ میّت نے انہیں تلاوت کلام پاک کی اُجرت تھمادی۔ (حالانکہ قرآنِ پاک کی تلاوت پر اُجرت لینا قطعی طور سے حرام ہے)۔ پھر وہ شاداں وخنداں رخصت ہوئے۔

راوی کا بیان ہے کہ وہ اثنائے راہ میں دانتوں میں خلال کرتے ہوئے

زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے جا رہے تھے اور اُس نوجوان مولوی صاحب پر فقرے چُست کرتے جا رہے تھے۔ جس نے ریت کی ایک مٹھی سے صدیوں سے بہتے چلے آ رہے دریائے جہلم کی سمت کو بدلنے کی کوشش کی تھی!!

⁂

۳۲. فانی/لافانی

انسان کو ''عالمِ اصغر'' کہا گیا ہے۔ اس عالمِ اصغر کی ظاہری صورت چند اعضاء کے مجموعے کا نام ہے۔ ہاتھ، پاؤں، دھڑ، سر وغیرہ۔ اگر اس مجموعے میں ایک معقول وموزون تناسب ہو تو انسان وجیہہ، دلکش اور خوبصورت کہلاتا ہے۔ رہی کالا یا گورا ہونے کی بات تو یہ چنداں اہم نہیں۔ کتنے ہی گورے ہیں جو غیر متناسب بدن کی وجہ سے چمپنزی (Chimpanzee) لگتے ہیں اور کتنے ہی کالے ہیں جو متناسب جسم کی وجہ سے ہیرو کہلاتے ہیں۔ اب دیکھئے آپ ایک گوری چٹی دودھ ملائی سے بنی عورت کو دیکھتے ہیں۔ اس کے گلابی ہونٹ، موتیوں جیسے دانت، ستواں خنجر نما ناک بھنوئیں، چاہِ ذقن، خمدار زلفیں وغیرہ آپ پر قیامت ڈھانے کو ہوتی ہیں کہ آپ کی نظریں اُس سے چار ہو جاتی ہیں۔ نظریں چار ہوتے

ہی آپ کا شیشۂ دل ٹوٹ کر دو نیم ہو جاتا ہے کیونکہ موصوفہ کی آنکھیں کرنجی ہیں۔ آپ صحیح ذوقِ جمال یعنی Aesthetic Sense رکھتے ہوں تو آپ یقیناً اس کی طرف دوبارہ دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔ اسی طرح اگر کسی کی آنکھیں تو نرگسی لیکن ہونٹ افریقی ہیں تو بھی آپ کی طبیعت کا منغّص ہونا یقینی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ مردانہ حسن میں دراز قد، بھر بھرا جسم، چوڑا چکلا سینہ، مضبوط کندھے، ابھری ہوئی مچھلی والے بازو، فراخ ماتھا، چمکدار آنکھیں، کتابی چہرہ وغیرہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سب کسی مرد میں ہے بھی لیکن ناک ٹماٹر نما ہے تو مردانہ حسن کا تمام تصور خاک ہو جاتا ہے۔ ایسا مرد باکسنگ کا چمپئن ہو سکتا ہے لیکن کسی کے خوابوں کا شہزادہ نہیں ہو سکتا۔ گویا انسان کے جسم کا ہر زاوئیے سے خوبصورت ہونا اہم ہے۔ اگر ایک نا قابل لحاظ زاوئیے سے بھی اُس کے جسم میں کوئی ٹیڑھ نظر آئے تو تمام جسم جوہر شناس نظروں میں مردود ٹھہرتا ہے۔

اس بات سے کون واقف نہیں کہ انسان محض جسم و جان کا نام نہیں۔ جب تک جسم و جان کے ساتھ ''کردار'' کو وابستہ نہ کیا جائے، ''انسان'' کا لفظ تشنۂ معنی ہی رہتا ہے۔ گویا انسانی جسم اور کردار لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے جسم کی طرح ہی انسان کا کردار بھی بے داغ ہونا چاہئے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کوئی بھی شخص کامیاب سٹیٹس مین (Statesman) کامیاب مبلغ، کامیاب تاجر، کامیاب افسر ہو سکتا ہے لیکن کامیاب انسان نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص کامیاب انسان نہیں وہ اپنے وجود کے اصل مقصد اور غرض و غائت سے ہمیشہ دور ہی رہتا ہے۔ اب ایک شخص کو لیجئے کہ اس کا جسم مثالی ہے۔ اُسے دیکھ کر راہ چلتے لوگ رُک جاتے ہیں۔ (کسی کو رُکنے کی فرصت نہ ہو تو بھی اُس کی طرف مڑ کر دیکھے بنا نہیں گزر سکتا۔) اس پر طرّہ یہ کہ وہ حلیم النفس اور فرض شناس ہے۔ رشوت نہیں لیتا، شراب نہیں پیتا، ریس جو اُ نہیں کھیلتا، دھینگا مشتی اور بدزبانی نہیں کرتا۔ دغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے کردار میں

بس ایک نقص ہے کہ جھوٹ بولتا ہے اور وعدے وفا نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی ساری کی ساری خوبیاں کردار کے بس ایک نقص سے پیوند خاک ہو جائیں گی۔

آپ کسی مجبوری کے تحت بھی اسے اپنا آئیڈیل (Ideal) بنانے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی کالا کلوٹا سا، منحنی سا، مدقوق سا آدمی ہے جسے ایک بار دیکھ کر دوسری بار دیکھنے کی عام طور پر آرزو نہیں ہو سکتی لیکن اس کے کردار میں توانائی اور صلابت ہے تو ہر کوئی اسے بار بار دیکھنے بلکہ دیدار کرنے کی تمنا خانۂ دل میں ضرور رکھے گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی اس کارگہہ ہستی میں کمی نہیں رہی ہے۔ آج باڈی بلڈنگ (Body Building) کے لئے نت نئے سامان وجود میں آرہے ہیں۔ اس کے لئے باضابطہ انسٹی چیوٹ کھل رہے ہیں اور لوگ جوق در جوق آگے آرہے ہیں لیکن میرے خیال میں باڈی بلڈنگ سے زیادہ آج کے انسان کو کریکٹر بلڈنگ (Character Building) کی ضرورت ہے کیونکہ باڈی فانی اور کریکٹر لافانی ہے!

* * *

۳۳. جذبۂ چنگیزی

اب قتل وغارت گری کوئی حیرت افزاء بات نہیں رہی ہے ۔ جو بھی چاہتا ہے دوسرے کو کھیل تماشے کے طور پر کھیرے ککڑی کی طرح یا تو کاٹ کے رکھ دیتا ہے یا آتشیں کھلونا گھما کر اس کے وجود کو غربال بنا دیتا ہے ۔ اگر یہ سفاک مشغلہ یہاں تک ہی محدود رہتا تو طوعاً وکرہاً قبول ہوسکتا تھا لیکن جب کسی کو ایک تو قتل کیا جائے اور پھر اس کے رقص بسمل کا بھی تماشا کیا جائے، تو معاملہ انتہائی مکروہ بن جاتا ہے ۔ یہ خصوصیت کبھی رومی اکھاڑوں (Colosseums) سے وابستہ تھی کہ طبقۂ امراء اپنی خاص نگرانی میں وحشی درندوں کو پالتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ غریب غرباء اور دوسرے مظلوموں کی ایک خاصی تعداد بھی پالی جاتی تھی ۔ جب امراء کا جی کبھی کھیل تماشے کی طرف راغب ہوتا تو کئی درندوں کو بھوکا رکھا جاتا ۔

جب ان کی بھوک خوب چمک اٹھتی تو دس پانچ پلے ہوئے مظلوموں کو لاکر اکھاڑے میں انکے سامنے پھینکا جاتا۔ بھوکے درندے اُن پرٹوٹ پڑتے۔ وہ چیخ وپکار اور آہ وفغاں سے شورِ محشر برپا کرتے ہوئے درندوں کا حتی المقدور مقابلہ کرتے رہتے اور پھر مرگِ مفاجات کا شکار ہوجاتے۔ اس ساری کریہہ المنظر کارروائی کے دوران میں امراء اپنی بیگمات اور محبوباؤں کے ساتھ اونچے دریچوں اور دالانوں سے نظارہ کرتے ہوئے شرابِ ارغوانی کے جام لنڈھاتے ہوئے مسرت وشادمانی سے بے حال ہوتے رہتے۔

ایک انسان کو اس طرح موت کی وادی میں دھکیلنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انسان اپنے مقام سے نیچے آکر اسفل السافلین تک پہنچ گیا ہے جہاں سے اسکا دوبارہ عروج قریب قریب ناممکن ہے۔ انسان کو ربِ کائنات نے بہترین ساخت پر پیدا فرمایا تھا۔ (بحوالہ سورۂ تین) بہترین ساخت کا تو یہ تقاضا تھا کہ انسان کے اعمال وافعال قدسیوں کے ساتھ ہمرشتہ ہوتے لیکن اس کے برعکس وہ عالمِ شیطنت سے لاسلکی پر بے رحمی کے پیغامات وصول کر کے انہیں عملی جامہ پہناتا ہے۔ شیطان انسان کا محض ''دشمن'' ہے نہ کہ آقا اور فرماں روا، جس کے احکامات اور پیغامات کی پیروی کی جائے۔ جب تک انسان کے دل میں جذبۂ ترّحم موجود رہتا ہے، وہ ہر حال میں انسانیت کے جاموں میں ہی رہتا ہے۔ جب یہ جذبہ ماند پڑتا ہے یا ختم ہوجاتا ہے تو اس کے جسم کا ڈھانچہ رہتا تو انسانی ہے لیکن اس کے اندر شیطانی روح حلول کرجاتی ہے۔ پھر وہ ایسے کام کرتا ہے کہ دامنِ انسانیت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے داغدار ہوجاتا ہے اور اس کو ذرا بھی احساس نہیں ہوتا ...... چنگیز خان صحرائے گوبی کا ایک معمولی گڑریا تھا۔ جب شیطان نے اُس کے اندر حلول کرلیا تو وہ حیوان بن گیا۔ جب حکمران بنا تو خون آشام درندہ بن گیا۔ ایک بار اُسے خون کی چاٹ لگ گئی تو پھر انسانی خون کے بغیر کوئی بھی مشروب اس

کی نگاہوں میں پسندیدہ نہ رہا۔ پھر اس کی ابلیسی قلمرو کا یہ قانون بن گیا کہ جو سپاہی جتنی زیادہ انسانی کھوپڑیوں کا مینار تعمیر کر سکتا وہ اتنی ہی زیادہ ترقی پانے کا مستحق بن جاتا تھا۔ پھر ''رحم'' کا لفظ اس کی دنیا سے عنقا ہو گیا اور انسان کھیل کھلونے بن کے رہ گئے۔

ایک بار چنگیز سے اس کے کسی افسر نے پوچھا:

''اے خانِ خاناں! کیا آپ کو زندگی میں کبھی رحم آیا ہے!؟''

''ہاں ایک بار آیا ہے!''۔

''وہ کب!؟''

''میں گھوڑے پر سوار تن تنہا ایک بلند پہاڑی پگڈنڈی سے گزر رہا تھا کہ میرے کانوں میں کسی روتی بلکتی عورت کی آواز پڑ گئی۔ پاس جا کے معلوم ہوا کہ اُس کا شیر خوار بچہ اس کی گود سے پھسل کر ڈھلان سے بہت نیچے ایک بڑی خار دار جھاڑی میں اَٹک گیا تھا جہاں وہ ہزار کوشش کے بعد بھی نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ اس کی ممتا دیکھ کر مجھے رحم آ گیا۔ میں نے اپنے لمبے نیزے کی انی کس کر اُس بچے کے سینے میں پیوست کر دی۔ پھر اسے کھینچ کر ماں کے سپرد کر دیا!!''۔

* * *

۳۴۔ باعثِ تخریب

عام مثل ہے کہ ”شاعری کو گھاس سمجھ کر سب گدھے چرنے لگے“۔ اور یہ کچھ غلط بھی نہیں۔ آج ہر دس میں سے ایک آدمی شاعر نظر آتا ہے۔ شاعر نہ بھی ہو تو تخلص بردار ضرور ہوگا۔ انہیں علم ہی نہیں ہوتا کہ جب پِتّا پانی اور جگر خون ہو جاتا ہے تو شعر تخلیق ہوتا ہے۔ لیکن شاعر ہونے کی حد تک اس تجاوز کو برداشت اور گوارا کیا جاسکتا ہے کہ اُلٹا سیدھا شعر کہنے سے کسی قوم کی بنیاد کا پتھر نہیں ہلتا کیونکہ جب شاعر آج تک کسی قوم کو تعمیر ہی نہ کر سکا تو تخریب کیا کرے گا! یہاں یار لوگوں نے حضرت علامہ اقبالؒ کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھا اور وہ فریاد کرنے پر مجبور ہو گئے۔

من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمر دند

(ترجمہ: اے میرِ اُمم میری آپ سے فریاد ہے کہ لوگوں نے مجھے غزل خواں سمجھ لیا۔)

لیکن اس سب کے باوجود ایک اچھے شاعر اور شعر کی بے قدری نہیں کی جاسکتی۔ بہرحال! میں عرض کررہا تھا کہ ہر ایک کے شاعر ہوجانے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن ہر آدمی وعظ خواں اور مبلغ بن جائے تو بات بڑی سنجیدہ اور نازک بن جاتی ہے۔

بدقسمتی سے آج ان کی اتنی کثرت ہوگئی ہے کہ انسان پکارنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ ''مجھے وعظ خوانوں سے بچاؤ''۔

ایک بار میرا گزر ایک جامع مسجد سے ہوا جہاں ایک وعظ خواں بڑے مشتعل انداز میں علامہ اقبالؒ کا شعر اس طرح عرض فرما رہے تھے

تیری امام بے حضور تیرا نماز بے سرور
ایسی امام گزر، ایسا نماز گزر

شعر سن کر میں ٹھہر گیا تاکہ جی بھر کر رولوں لیکن جب کوئی شارع عام پر روتا ہے تو لوگ اُسے پاگل کہتے ہیں۔ اس۔ لئے پاگل کہلانے کے ڈر سے خاموش رہا۔

جی چاہا کہ مسجد میں داخل ہوجاؤں اور گلا پھاڑ کر چلاّؤں ''اے وعظ خواں! کیوں اپنی، علامہؒ کے اس نمول شعر کی اور سامعین کی مٹی پلید کررہے ہے؟! خدا کے لئے خاموش ہوجاؤ اور اس قوم پر رحم کرو جو پہلے ہی تار تار اور داغ داغ ہے!'' لیکن یہاں بھی پاگل کہلانے کے خوف سے مسجد کے اندر نہ جاسکا کیونکہ جو شخص جماعت اوّل میں فیل ہونے والے وعظ خواں سے قیل وقال کرے گا، وہ پاگل نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ سامعین کے سیخ پا ہونے کا بھی اندیشہ تھا کیونکہ وہ موصوف کے بہت زیادہ معتقد، مقلد اور مرید تھے۔ (جب لوگ بے سوچے سمجھے کسی پر ٹوٹ پڑتے

ہیں تو ان سے اپنے آپ کو بچانا بڑا ہی کارے دارد والا معاملہ ہوتا ہے)۔

تذکروں میں آیا ہے کہ ایک روز حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کہیں سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے ایک شخص کو ایک مجمعے کے سامنے وعظ کرتے دیکھ لیا۔ وہ ٹھہر گئے۔ جب واعظ اپنی بات ختم کر چکے تو حضرتؓ نے پوچھا: ''تم وعظ پڑھتے ہو لیکن کیا قرآن میں ''ناسخ'' اور ''منسوخ'' سے واقف ہو!''۔

اُس نے عرض کیا: ''نہیں یا حضرتؓ!''

''تو پھر جان لو کہ تم نے سامعین کے ساتھ ہی ساتھ اپنے آپ کو بھی ہلاکت میں ڈال دیا!''۔

سوچنا چاہیئے کہ ہر کس و ناکس کا بلا تکلف و تامل اپنے سر پر وعظ خوانی کی دستار باندھنا باعثِ تعمیر ہے یا باعثِ تخریب!؟

⁂

۳۵. بسم اللہ کی برکت

انسان اس صفحۂ ہستی پر گزر بسر کیلئے کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہے البتہ پیشے کا انتخاب اس کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے۔ جس قسم کی افتادِ طبع ہوگی، انسان اُسی قسم کا پیشہ اختیار کرے گا۔ تبلیغ اگرچہ پیشہ نہیں لیکن دورِ حاضر میں اس سے زیادہ منافع بخش اور کوئی بھی پیشہ نہیں رہا ہے۔ اس میں چونکہ دولت بھی ہے، شہرت بھی ہے اور عزت بھی، اس لئے یہ پیشہ کسی کی طبیعت کے ساتھ میل نہ بھی کھاتا ہو تو بھی ہر کوئی اسے اختیار کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ چنانچہ آج مبلغین کی اتنی کثرت ہوگئی ہے کہ اصل اور نقل میں امتیاز کرنا امر مشکل ہے۔ اصل مبلغ کی پہچان یہ ہے کہ وہ علم کی ترسیل حکمت اور مؤثر ڈھنگ سے کرسکے۔ اگر کہیں علم بھی ہے، حکمت بھی ہے لیکن طریقۂ اظہار مؤثر نہیں تو تبلیغ

بے مقصد ہو جاتی ہے۔ اب اسے کیا کیجئے کہ کچھ لوگوں کے پاس نہ تو علم ہوتا ہے، نہ حکمت و تاثیر لیکن چرب زبانی سے وہ انسان کے جذبات کو بس میں کر کے اپنا اُلو سیدھا کر لیتے ہیں۔

آپ کو بھی کبھی نہ کبھی یہ تجربہ ہو چکا ہوگا کہ مختلف قسم کی چھوٹی موٹی اشیاء بیچنے والے لوگ مسافر گاڑیوں میں در آتے ہیں اور اپنی چیزوں کی تعریفیں کر کے زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ بہت ہی کم لوگ چیز کے اچھا برا ہونے کی تمیز رکھتے ہیں اس لئے وہ خریداری کرتے وقت فریبِ نظر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک بار ایک موزہ فروش رُکی ہوئی مسافر بس میں چڑھ آیا۔ پہلے تو اس نے مسافروں پر ایک اچٹتی سی نگاہ دوڑائی۔ اس کے بعد ایک موزہ بستے سے نکالا اور بلند آواز میں فرمانے لگا: ”ہاں تو صاحبان! آپ نے، ماشاء اللہ، اپنی زندگی میں ہزاروں موزے استعمال کئے ہوں گے لیکن جو بات اس موزے میں ہے وہ کسی اور میں کہاں! یعنی ۔

جو بات تجھ میں ہے کسی اور میں نہیں

آپ ضرور سوچیں گے کہ میں پاپی پیٹ کی خاطر موزے کی تعریف کروں گا اور آپکو دھوکا دوں گا۔ جناب! یہ آپ کی سوچ کا نہیں، میری غریبی کا قصور ہے۔ غریب سچی بات بھی کہے گا لیکن آپ کو جھوٹی لگے گی۔ یہ موزہ دوکان پر ہوتا تو اپنی قیمت خود وصول کرتا۔ اسی لئے تو کشمیری میں کہا جاتا ہے کہ ”تھانس مول وانس پٹھ“ (تھان کا مول دکان پر ہی متعین ہوتا ہے۔) افسوس! غریب کے ہاتھ میں آ کر یہ موزہ بھی غریب بن گیا ہے۔ میں غریب ضرور ہوں لیکن آپ کی نظریں تو غریب نہیں ہیں۔ یہ دیکھئے میں اسے کھینچتا ہوں۔ کیا مجال ایک تار بھی اِدھر اُدھر ہو جائے...... بسم اللہ الرحمٰن الرحیم...... دیکھئے، دیکھئے، دیکھتے جائیے...... ”ٹھاک“! ...... اور موزہ آواز کے ساتھ گاڑی کی چھت سے ٹکرایا۔ لوگوں کا تذبذب دور

ہونے کو تھا کہ ایک ظریف آدمی نے اونچی آواز میں کہا:

’’موزے والے بھیا! تم نے بے شک موزے کو کس کے کھینچا اور یہ پھر بھی قائم رہا۔ لیکن یہ سب موزے کی مضبوطی کا نہیں بلکہ بسم اللہ کی برکت کا ثبوت ہے!!‘‘

ساری سواریاں دل کھول کر ہنس پڑیں۔ لیکن میری نگاہوں کے سامنے شیکسپیئر کی کتاب ’’جولیس سیزر‘‘ کا وہ سین گھوم گیا جس میں ’’انٹونی‘‘ سیزر کا خون آلود لباس دکھاتے ہوئے ہجوم سے کہتا ہے: ’’کیسا قابل رحم نظارہ ہے، کیسا خونین منظر!! انتقام لو، آگ لگاؤ، مارڈالو، قتل کرو!!‘‘

اور پھر ہجوم بپھر اٹھتا ہے!...... موزہ فروش کو ایک ظریف کے مختصر سے جملے نے خاموش کردیا کیونکہ اس کی کوئی ساکھ نہیں تھی۔ کاش ایسے ہی ظریف ہر گھر ہر گلی میں جنم لیں اور لچھے دار باتیں کرنے والے جاہل استحصال پسند مبلّغوں کے منہ بند کرسکیں جن کی ساکھ اور دھاک سے عوام کے منہ بند ہیں!!!۔

⁂

۳۶. تفاوت

26/جنوری 2001ء کی صبح کو گجرات میں ایک ہولناک زلزلہ آیا جس میں ایک محتاط تخمینے کے مطابق چالیس ہزار کے قریب انسانی جانیں تلف ہوئیں اور کئی شہر و دیہات قبرستان بن کے رہ گئے۔ ایک ہنستا کھیلتا گھرانہ مکان گرنے سے دب گیا، لیکن قسمت کے سکندر تھے کہ مرے نہیں بلکہ پھنس کے رہ گئے۔ ان کا ایک پالتو کتا تھا۔ وہ چونکہ مکان سے باہر تھا اس لئے دبنے سے بچ گیا۔ مالکوں کی حالتِ زار دیکھ کر وہ اونچی آواز میں پہلے تو روتا رہا اور پھر اپنی جان پر کھیل کر اندر جا گھسا۔ چھوٹے بچوں کو گھسیٹ کر ایک سوراخ سے باہر نکالا اور صحن میں ڈال دیا۔ پھر اندر گھس کر بڑے لوگوں کو بھی باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگا لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ تھک ہار کر اس نے منہ اٹھا کر زور زور سے رونا شروع کیا۔ لیکن جب نفسا نفسی

کا عالم ہو تو کوئی کتے کی فریاد پر کیوں کان دھرنے لگا۔ کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر وہ دوڑتا ہوا ایک کھلی جگہ پر گیا جہاں آہ وفغاں کرنے والے مصیبت زدہ لوگوں کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔ اس نے فریاد کرتے ہوئے ایک آدمی کا دامن دانتوں سے پکڑا اور اسے اپنے مکان کی طرف کھینچنے لگا۔ بات لوگوں کی سمجھ میں آگئی اور وہ اس کے دنبال میں چلے گئے۔ حقیقت حال سے واقف ہو کر انہوں نے ملبے کو ذرا صاف کیا اور اہل خانہ کو بچالیا۔

ایک لاولد شخص کا اُس یتیم وبیسیر بچے کے ساتھ کوئی خونی رشتہ نہیں تھا لیکن پھر بھی اس نے اسے گھر لایا اور اپنی بیوی کی گود میں ڈال دیا۔ پھر تو میاں بیوی نے اس بچے کی ساخت و پرداخت کو مقصد حیات بنالیا۔ ان کا سورج اسی کو دیکھتے ہوئے طلوع بھی ہوتا تھا اور غروب بھی۔ شام بھی اسی کی بلائیں لیتی ہوئی گھر میں قدم رکھتی تھی اور صبح بھی۔ شاید انہوں نے ضرورت سے بھی زیادہ اپنی امیدوں کے دھاگے کو اس کی ذات سے باندھ لیا تھا۔ پھر ماہ وسال کی گردش کے درمیان جب میاں بیوی کی آنکھوں پر چشمے چڑھ گئے تو انہوں نے اسی جوان گبرو منہ بولے بیٹے کی آنکھوں سے دیکھنا شروع کیا۔ ایک دن میاں نے تجوری سے اسی کے ہاتھوں پچاس ہزار روپے کی نوٹوں کی گڈی نکلوائی اور اپنی صدری کی اندرونی جیب میں رکھ لی جہاں تک عام طور سے جیب کتروں کی شیطانی انگلیاں رسائی نہیں پاتیں۔ سکوٹر کو کک ماری۔ منہ بولے بیٹے کو اپنے عقب میں سوار کیا اور شہر کی طرف چل دیا۔ وہ گھنے باغات کے درمیان سے گزرنے والی ادھ پکی سڑک پر مناسب رفتار سے جا رہا تھا کہ ایک جگہ سڑک کراس کرنے والے ایک کتے کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گیا۔ حادثہ ہوتے ہوتے اس کے دماغ میں دو خیال کوندے کی طرح لپکے:

”اللہ! میرے بیٹے کو بچالے!! مولا! میری پونجی کی حفاظت کرنا!!“ جب

اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو سڑک کے درمیان اور سکوٹر کو بائیں طرف کی کھائی میں آڑا ترچھا پایا۔ اس کی آوارہ نظریں بیٹے کو تلاش کرنے لگیں لیکن وہ نہیں تھا۔ ایک وسوسے نے سر اُبھارا ''کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا اور کوئی اسے اٹھا کر ہسپتال لے گیا!؟'' پھر معاً اُس کا بایاں ہاتھ اپنی صدری کی دائیں جیب کی طرف گیا لیکن وہاں سے نوٹوں کی گڈی غائب تھی۔ ایک چھناکے کے ساتھ اس کی توقعات کا قدِ آدم شیشہ ٹوٹ کر بکھر گیا اور ایک مکروہ حقیقت اس میں سے کسی سینگوں والے شیطان کی طرح جھانکنے لگی۔ پھر وہ سسک پڑا۔ نہ جانے کیوں!؟

⁂

۳۷. ماسوائے گُل

شاید میں کہیں کہہ چکا ہوں کہ مجھے کسی بھی چیز سے نفرت نہیں۔ بس سیاست، دیمک اور شور کو ناپسند کرتا ہوں۔ سیاست کو اس لئے کہ یہ انسانوں کی دنیا میں خاردار جھاڑیوں کی کاشت کر کے کانٹوں کی تجارت کرتی ہے۔ دیمک کو اس لئے کہ یہ کتابوں کو چاٹ کر الفاظ کی خوبصورت دنیا کو داغدار کرتی ہے اور شور کو اس لئے کہ یہ سکون و اطمینان کی دنیا کو غارت کرتا ہے۔ لیکن میری پسند ناپسند سے کیا ہوتا ہے؟ ایک سیاست ہی کو لیجئے۔ یہ 1947ء سے ہماری زندگی کا جزو لاینفک بن گئی ہے۔ آپ لاکھ نہ چاہتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح اس سے نتھی ہو ہی جائیں گے۔ مثلاً: آپ دفتر وقت پر پہنچنے کی فکر میں بھاگم بھاگ گھر سے روانہ ہو کر گاڑی میں سوار ہوتے ہیں۔ آپ کے تصور میں صرف آپ کا دفتر

ہے اور بس۔ اچانک آپ کا ہمنشین خواہ مخواہ آپ کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے: ”ہاں جناب! رات کو بی بی سی سنا؟...... لیکن یہ بی بی سی والے بھی کشمیر کے تئیں سرد مہری برت رہے ہیں۔ سائبیریا میں کسی مینڈکی کو زُکام ہو جائے تو یہ لوگ اُسے بانس پر چڑھاتے ہیں۔ اِدھر ایک دن میں درجن بھر آدمی مرگِ مفاجات کا شکار ہو جائیں تو یہ سرکاری ترجمان کے سر منڈھ کر ایک آدھ جملہ فرماتے ہیں اور معاملہ آیا گیا ہو جاتا ہے۔ ویسے وہ واویلا کریں بھی تو کیوں؟ وہ بھی تو انگریزوں کے پٹھے ہیں۔ نامراد انگریز ہی نے تو یہاں سب بکھیڑا کھڑا کر دیا ہے۔ اس کی شیطنت کارفرما نہ ہوتی تو برصغیر میں جھگڑا ہی کس بات کا تھا؟ جناب دو بھائیوں میں بٹوارا ہوتا ہے تو کیا اُن کا خون سفید ہو جاتا ہے؟ نہیں نا؟!...... وہ عقل کے اندھے نہ ہوں تو بٹوارے کے بعد ہی زیادہ پیار و محبت اور اخوت سے رہتے ہیں اور دکھ سکھ کے ساجھی بن جاتے ہیں۔ لیکن یہاں تو بس اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ کشمیر کی چار چپے والی زمین کو لے کر دو بھائی ترپین سال سے دست و گریباں ہیں۔ ہر روز ”بات چیت“ کی رٹ سنتے سنتے کان پک گئے ہیں لیکن بات چیت ہے کہ ہوتی ہی نہیں اور ہوتی بھی ہے تو لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے! نہ جانے کتنے لوگ مسئلے کے حل کی آرزو کو سینے میں لئے دفن ہو گئے لیکن مسئلہ ہے کہ سطحِ زمین پر اپنی روز افزوں شدت کے ساتھ قائم و دائم ہے۔ لیکن مسئلہ ختم ہو بھی تو کیسے؟ اٹل جی فرماتے ہیں کہ وہ جان دیں گے لیکن کشمیر کی ایک انچ زمین نہیں دیں گے۔ جواب میں مشرف صاحب مسئلے کو ہر حال میں طے کرنے کی بات کرتے ہیں۔ مسئلہ حل ہو تو کیسے!؟ یعنی میں دیتا نہیں اور آپ چھوڑنے پر تیار نہیں۔ اس طرح کی صورتحال میں جب بھی بات چیت ہو گی تو نتیجہ ڈھاک کے تین پات کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کہتا ہے کہ ”بہت ہو چکا۔ اب ہمیں مسئلے کو ہمیشہ کے لئے حل کر ہی لینا چاہئے!“

ہندوستان بھی حامی بھرتے ہوئے کہتا ہے ”بالکل ٹھیک! آخر کب تک ہمارے لوگ کٹتے مرتے رہیں گے! چلو مسئلے کو حل کر لیں“۔

جب ساتھ بیٹھتے ہیں تو دونوں ہی کہتے ہیں ”یہ بھی تیرا، وہ بھی تیرا، لیکن کشمیر میرا!“ یعنی

آ عندلیب صلح کریں جنگ ہو چکی
لے اے زباں دراز تُو سب کچھ سوائے گل

* * *

---

14 فروری 2001ء

اٹل بہاری واجپائی اور جنرل پرویز مشرف کی آگرہ کانفرنس کے موقعے پر لکھا گیا۔

۳۸۔ نزاکتِ احساس

جانوروں میں انسان سے بڑھ کر صلاحیتیں ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود انسان ہی ''اشرف المخلوقات'' کا خطاب پاتا ہے۔ یہ زبردست قوتِ احساس اور قوتِ تخلیق ہے جو انسان کو جانوروں پر فوقیت عطا کرتی ہے۔ لیکن یہی قوتیں جب شدید بن جاتی ہیں تو باعثِ تخریب ثابت ہوتی ہیں...... انسان نے مدتوں سر کھپایا اور بجلی ایجاد کی۔ قوتِ تخلیق کی شدت نے اُسے نچلاّ نہیں بیٹھنے دیا اور ایٹم بم بنالیا۔ جانور اپنے سامنے روز دوسرے جانوروں کو مرتے دیکھتا ہے لیکن وہ بس تھوڑی دیر کے لئے اثر قبول کرتا ہے اور پھر شانت ہو جاتا ہے لیکن انسان کسی کو مرتا ہوا دیکھے تو اس کے دل و دماغ میں احساسات کے بگولے اٹھتے ہیں اور اسے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ لیکن شدتِ احساس کا حیطۂ عمل ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا۔ ایک عام

آدمی کسی کو سڑک پر خون میں لت پت دیکھتا ہے اور حسبِ توفیق یا تو اپنے سر کو دو چار بار دائیں بائیں ہلاتا ہوا اور زبان سے "چہ چہ چہ" کی آواز خارج کرتا ہوا اپنی راہ پر ہولیتا ہے یا آگے بڑھ کر اس کی ضروری مدد کر کے اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔ لیکن ایک فنکار میں شدتِ احساس حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لئے جب اس کا گزر کسی ایسے حادثے پر ہوتا ہے تو وہ چاہے ہاتھ پاؤں سے کوئی ضروری مدد بہم بھی نہ پہنچائے لیکن اس کی حالت متغیر ہو جاتی ہے۔ احساس کی شدت اس کے دل ودماغ پر ضربیں رسید کرتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے محسوسات کو اپنے فن کی زبان عطا کرتا ہے۔

یہ شدتِ احساس کسی بھی فنکار کو اپنے سماج اور ماحول سے منفرد بنا دیتی ہے اور وہ اپنے آپ کو بڑی مشکل سے ایڈجسٹ کر پاتا ہے۔ لیکن ایڈجسٹمنٹ کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ جو شخص اپنے ماحول میں نہیں کھپ سکتا، ماحول کو اس کی ضرورت نہیں رہتی۔ اب جس کی ضرورت کسی کو محسوس نہ ہو، اس کی اہمیت اضافی بن جاتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ فنکار اپنے گرد و پیش کو اپنے مزاج سے ہم آہنگ دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے یکسوئی، سکون واطمینان کی ضرورت ہے لیکن اس کے ماحول میں یہی چیزیں عنقا ہیں۔ جب اس کے فن کو مناسب ماحول نہیں ملتا تو وہ بوکھلا کر طرح طرح کی حرکتیں کرتا ہے لیکن اسکی ان حرکتوں سے کسی کی ذاتیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور ہر کوئی اپنے مزاج کے تحت اپنی دنیا بساتا رہتا ہے جس میں اس کی شدت احساس کیلئے کسی قسم کے بھی گریس مارکس نہیں ہوتے۔ نتیجے کے طور پر وہ یا تو شدت پسند بن جاتا ہے یا خبطی۔ دونوں ہی صورتوں میں اسکے پیچھے گلی کے لونڈے لگ جاتے ہیں اور کسی واہمے کی طرح اُسکا پیچھا کرتے ہیں۔

اس طرح کے ردِّعمل سے کوئی بھی فنکار نہ اپنے فن کے لئے سازگار ماحول تیار کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو اپنی پسند کا طرزِ زندگی اختیار کرنے پر مجبور کر سکتا ہے

۔ لوگ ہمیشہ اوروں کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ ہاں بس ایک چیز ہے جو انسان کو اپنی دست برد کی زد میں ہے اور وہ ہے اس کی اپنی ذات!

ہر چند کہ وہ اپنی ذات کے فطری تقاضوں کو بھی بدلنے کا اہل نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی وہ ان کو کوئی نئی جہت دے سکتا ہے۔ جہات کی یہ تبدیلی اکثر اوقات مثبت نتائج سامنے لاتی ہے۔ کوئی اپنی ذات کے تقاضوں کو ساکت و جامد رکھنے پر بضد رہے گا تو اسے یقینی طور سے دوسرے کے پتھر کھانے کے لئے ہمیشہ تیار رہنا چاہئے۔ بقول نوشاد علیؔ

اچھی نہیں نزاکتِ احساس اس قدر
شیشہ اگر بنو گے تو پتھر بھی آئے گا

⁂

۳۹. کالی دُنیا

ہمارے یہ بزرگ مرد وزَن وہ بلند وبالا چھتنار درخت تھے جو پھل بھی دیتے تھے اور سایہ بھی۔ لکڑی بھی دیتے تھے اور ایندھن بھی۔ ان کی گھنی چھاؤں میں وحوش وطیور بھی بسیرا کرتے تھے۔ لیکن وقت کی آندھی نے انہیں جھلسا دیا ہے اور اب ٹنڈ منڈ کھڑے ہیں۔ محکمہ سوشل ویلفیئر کی طرز پر کسی اہل دل نے (شاید ان بزرگوں کی عظمت رفتہ کو یاد کر کے یا کسی اور انسانی فرض کو محسوس کرتے ہوئے) ایک فلاحی ادارہ قائم کرلیا جس کا مقصد ان گرتوں کو تھامنا ہے۔ اُس نے ادارے میں درجنوں ملازم بھرتی کرلئے۔ پھر ادارے نے مشتہر کیا کہ انہوں نے ایسے فارم چھپوالئے ہیں جنہیں بھر کر یہ راندۂ روزگار لوگ مالی معاونت حاصل کرسکتے ہیں۔ یہ بات معلوم ہوتے ہی ہر طرف اُمیدوں کے ہزاروں دیئے جل اُٹھے لیکن

اس کے ساتھ ہی عاقبت فراموش زر پرست انسان نما حیوانوں کے بھی کان کھڑے ہوگئے اور ریشہ دوانیوں کا مکروہ جال ترتیب پانے لگا۔

پہلے دن مذکورہ ادارے کے دفتر کے باہر بے کسوں کی ایسی بھیڑ دیکھنے کو ملی کہ کھوے سے کھوا چل رہا تھا۔ غیر مستحق موقعہ شناس لوگوں کی ایک خاصی تعداد بھی سُن گن لیتی پھر رہی تھی۔ دوسرے دن وہ بھی دفتر پر پل پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے فارموں کا اکال پڑ گیا۔ پھر دو تین روز تک یہ ہوتا رہا کہ لوگ فارم حاصل کرنے کے لئے جاتے رہے اور پانچ بجے شام مایوس لوٹتے رہے۔ ایک دن طوطے کی سی ناک والے تنگ جبیں دراز قد شخص نے ایک بزرگ کے دائیں کان میں یہ بات پھونک دی کہ فارم کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں فلاں دکان پر دستیاب ہیں۔ دوکان کے سامنے لوگوں کی لائن لگ گئی اور بیس پچیس پیسے کی مالیت کا فارم پانچ روپے میں خرید کر وہ باری تعالیٰ کا شکر ادا کرتے لوٹے۔ پھر انہوں نے بابو لوگوں کی منّت سماجت کر کے ان سے اپنے فارم پُر کروائے اور انہیں لے کر دفتر کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ ایک بھینگے کلرک نے دروازے کے روزن سے باہر جھانکا اور پکارا ''اے سنو! ہر فارم کے ساتھ عدالت کے بیان حلفی کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے بغیر کوئی بھی فارم قبول نہیں کیا جائے گا''۔ سائل لوگ ایک دوسرے پر سبقت لیتے ہوئے عدالت کی طرف دوڑ پڑے اور ایامِ زمہریر میں بھی مکھیاں مارنے والے میلے عرائض نویسوں کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے بیاناتِ حلفی لکھے اور قانونی نکتہ یہ اُبھارا کہ بیانِ حلفی ''نوٹری'' کی تصدیق کے بغیر بے معنی ہے۔ اس طرح مجبوروں معذوروں نے مبلغ پچاس روپے ضرب ڈبل نصف جس کے مبلغ پچیس روپے ہوتے ہیں، بقائمی ہوش وحواسِ خمسہ بلا جبر و اکراہ اُن کی جیبوں کی نذر کئے اور بگٹٹ دفتر مذکور کی طرف بھاگے۔ وہاں معلوم ہوا کہ دفتر بند ہو چکا ہے اور کلرک صاحبان تشریف لے جا چکے ہیں۔

دوسرے دن وہ پھر حاضر ہوئے اور باہر انتظار کرنے لگے۔ جب پاس والی جامع مسجد سے موذّن نے ظہر کی اذان دی تو دفتر کا دروازہ کھلا اور ملگجی ٹوپی والے چپراسی نے بے رُخی سے کہا: ''ارے بھئی ٹھہرو، بات سنو! صاحب فرماتے ہیں کہ کوئی بھی فارم اُس وقت تک قبول نہیں کیا جائے گا جب تک فارم ایک فائل کور میں بند نہ ہو اور اُس کے ساتھ ایک اچھی سی نوٹ بُک یعنی ''کاپی'' منسلک نہ ہو!''۔ سب آہیں بھرتے ہوئے صحن میں جمع ہوئے تو نہ جانے یہ افواہ کہاں سے اڑی کہ فائل کور اور ''کاپی'' فلاں بُک سیلر کے پاس تیار بہ تیار حالت میں موجود ہیں۔ لوگ اُس کتب فروش کی دکان کے سامنے یہ سامان) حاصل کرنے کیلئے دھکم پیل کرنے لگے۔ (یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ معمر خواتین اور ضعیف لوگ کچلے گئے)۔ وہ دس روپے میں مذکورہ سامان حاصل کرکے لوٹے۔ ابھی دفتر کے کاری ڈور میں پہنچے ہی تھے کہ ایک پستہ قد کلرک کو کھڑا پایا۔ اُس نے ایک سائل کا فارم لیا اور ماتھے کو دائیں ہاتھ سے پیٹتے ہوئے کہا ''افسوس، صد افسوس!! ارے یارو تم لوگوں کی تو مَت ہی ماری گئی ہے۔ ارے تم نے تو فارم پر ایک ہی فوٹو چسپاں کیا ہے جب کہ تم کو تین فوٹو چسپاں کرنے ہیں۔ دو فارم پر۔ یہاں اور یہاں۔ ایک نوٹ بک پر، یہاں!'' یہ انکشاف سن کر سبھی پلٹے اور پاس والے فوٹو گرافی کی دکان چمک اُٹھی۔ اس طرح فوٹو سٹیٹ والے، عرائض نویس، وکیل، کتب فروش کے ساتھ اُس کا بھی کلیان ہو گیا۔ پھر مجبور بزرگوں نے فارم داخل کئے اور گھر آ کر شب و روز کو ماہِ صیام کے دنوں کی طرح شمار کرنے لگے۔

جب یہ افسوسناک داستان میں ایک عمر رسیدہ پڑھے لکھے شخص کو سُنا رہا تھا تو وہ ہر جملہ سن کر سبحان اللہ، لاحول ولاقوۃ الاباللہ، یارب ظلمت نفسی ظلماً کثیرا کا ورد کرتا ہوا اظہارِ رنج وغم کرتا جارہا تھا۔ میں سمجھ بیٹھا کہ بزرگوں کی حالت زار اُس کے دل وجگر کو پارہ پارہ کررہی ہے۔ لیکن اچانک اُس نے مجھ سے رازدارانہ لہجے

میں کہا'' جناب! بہت سارے لوگ آپ کے پاس فارم بھرنے کے لئے آتے ہی رہتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ انہیں کسی نہ کسی طرح میری دکان پر بھیجتے رہیں۔ میری کئی چیزیں مدت سے خریدار کے انتظار میں گرد آلود ہورہی ہیں۔ دیکھئے آپ کا کمیشن میرے ذمہ! یارب ظلمت نفسی ظلماً کثیرا!!''

میں لرز اٹھا۔ میری لرزش سے پاس رکھی سیاہی کی دوات اُلٹ گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ سیاہی میری آنکھوں میں بھر گئی جس سے ہر شئے کالی ہی کالی دِکھنے لگی اور کالی دنیا میں کالے آدمی مجنونانہ رقص کرنے لگے!!

* * *

۴۰. برکتِ ابلیس

ماپ تول کے عمل میں دوسروں کو گھاٹا دینے والے اپنے آپ کو چالاک اور ذہین ہونے کے علاوہ فنکار بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ فنکاری اور ذہانت کی نہیں ذہنی پستی اور اخلاقی انحطاط کی بدترین مثال ہے۔ اشیاء میں ملاوٹ بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ گاہک معیاری چیز کے لئے قیمت ادا کرتا ہے لیکن لیتا غیر معیاری ملاوٹ شدہ چیز ہے۔ دورِ حاضر میں کوئی بھی شخص کوئی چیز خرید کے وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے خالص چیز خریدی ہے۔ ہر کوئی حیران و پریشان ہے کہ اس وباء کا کیا علاج کیا جائے! اس طرح سے اشیاء میں ملاوٹ کا رُجحان ایک قومی مسئلے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

قرآن مجید کی دنیا میں اس قسم کے لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ آیاتِ

کریمہ سے ثابت ہے کہ کئی قوموں کو اسی اخلاقی پستی کی وجہ سے ہلاک کیا گیا ہے۔ (مثلاً اصحابِ مدین۔ اصحاب الایکہ) لیکن آج چونکہ قرآنی آب و ہوا میں لوگوں کا دَم گھٹ جاتا ہے، اس لئے وہ اس کے احکامات کو جانتے مانتے تو ہیں لیکن اپنے عمل سے ان پر صاد نہیں کرتے۔ نتیجے کے طور پر دوسری اخلاقی بیماریوں کے ساتھ ہی ساتھ ملاوٹ کرنے کا ڈنکا بھی ہر طرف زور و شور سے بج رہا ہے۔

میں نے ایک بزرگ پھیری والے سے زیرہ خریدا۔ یہاں عام رواج ہے کہ لوگ روپے پیسہ گننے اور کوئی چیز ماپنے تولنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے ہیں اور پھر پہلے باٹ کے تول کے ساتھ (گنتی اور ماپ کے ساتھ بھی) "برکت خدا" کہتے ہیں۔ یعنی برکتِ خدا، دو، تین، چار، پانچ .... لیکن مذکورہ زیرہ فروش برکتِ خدا، برکتِ دو، برکتِ تین، برکتِ چار، برکتِ پانچ...... کہتا گیا اور زیرہ سوگرام کے باٹ سے تولتا گیا۔ زیرہ رات کو سالن میں ڈالا گیا تو کھانا کھاتے وقت طبیعت مکدّر ہو گئی کیونکہ ریت کے ذرات سالن میں تہہ نشین پائے گئے۔ صبح کھلی دھوپ میں ہم نے جانچ کی تو ہم رنگ و ہمشکل ریت کو دام ہمرنگ زمین کی طرح زیرے کے ساتھ شیر و شکر پایا۔ ہم کڑھے تو بہت لیکن کچھ نہ کر سکے کیونکہ پھیری والا زیرہ فروش غیر مقامی تھا اور پھر جب چڑیاں کھیت چگ چکی ہوں تو پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

ایک دن حسنِ اتفاق سے وہ پھر ہمارے صحن میں نمودار ہوا۔ جی چاہا کہ ضربِ شدید اُس کے سر پر رسید کر کے اسے ملکِ عدم کے سفر پر روانہ کروں لیکن تعلیم یافتہ لوگوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ اقدام کرنے سے پہلے سوچتے ہیں۔ جبکہ جہلاء پہلے کوئی اقدام کر بیٹھتے ہیں اور بعد میں سوچتے ہیں۔ میں نے بھی سوچان اور غصّے کی آگ کو شعور کے پانی سے ٹھنڈا کیا اور اسے زیرے کی ملاوٹ والی بات بتائی۔ اُس کے چہرے کا رنگ یکدم متغیر ہو گیا اور زبان کی

سوئی جیسے بیک وقت ریڈیو سیٹ پر دو اسٹیشنوں کو کیچ (Catch) کرنے لگی۔ لیکن اس نے جلد ہی سنبھالا لیا اور ہمارے پیش کئے ہوئے زیرے کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد اپنے دائیں ہاتھ سے پیشانی کو پیٹ ڈالا: ''ہائے افسوس! افسوس!! افسوس!!! لعنت ہے اُس ہمسائے خلیل خان پر جس نے یہ ملاوٹ والا زیرہ مجھے فروخت کیا اور میں نے آپ کو دیا۔ اجی حاجی صاحب! مجھ پر دھتکار، پھٹکار جو میں نے زیرے کو بنا پرکھے لے لیا اور جناب کے سامنے خجل وخوار ہو گیا۔ افسوس! افسوس!! میں شرمندہ ہوا، برباد ہوا۔ اجی اب میں آپ کے گھر سے کس طرح رخصت ہو جاؤں؟! دیکھئے حاجی صاحب! خدا کے لئے مجھے معاف کیجئے۔ میں آپ کو نیا زیرہ تول کے دوں گا۔ مجھے معاف کیجئے!!'' یہ کہتے ہوئے اس نے دائیں ہاتھ سے میری ٹھوڑی پکڑ لی اور میری نئی نئی پالی ہوئی داڑھی میں گدگدی ہونے لگی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑا۔ (اس قسم کے مواقع پر شدتِ جذبات کے بجائے خوش طبعی اکسیر ہوتی ہے۔) میری خوش طبعی اکسیر ثابت ہوئی اور اس نے سوگرام کے باٹ سے تولنا شروع کیا: ''برکت ....'' لیکن اس سے پہلے کہ وہ ''خدا'' کہتا، میں نے اسے ہنستے ہوئے ٹوکا ''نہیں میرے بھائی! برکتِ خدا'' مت کہو بلکہ ''برکتِ ابلیس'' کہو کیونکہ ملاوٹ والی چیزوں کو تولتے وقت اللہ کے مقدس نام کو ملوث نہیں کرنا چاہئے۔ اس کا نام صرف پاکیزہ چیزوں کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے اور ملاوٹ پاکیزہ چیز کو بھی ناپاک کرتی ہے جو رحمانی نہیں بلکہ شیطانی فعل ہے!''

⁂

۱۴۱. عیدِ معصوماں

عید کے دن کھیل کھلونوں کی ایک بڑی دُکان گاؤں کے قلب میں سجی تھی۔ دُکان پر عسکری مزاج کی عکاسی کرنے والی ایل۔ ایم۔ جی، کلاشنکوف اور پستول تھی۔ آگے پیچھے سے چنگاریاں چھوڑنے والے میزائل بردار بمبار جہاز اور ہیلی کوپٹر تھے۔ دھک دھک کرنے والی ٹینک تھی۔ چھک چھک چلنے والی ریل گاڑی تھی۔ پوں پوں کرتی موٹر سائیکل تھی۔ چمچماتی ٹاٹا سومو اور ماروتی کار تھی۔ چوں چوں کرتی چڑیا تھی۔ بھوں بھوں بولتا کتا تھا۔ ٹیں ٹیں کرتا طوطا تھا۔ کائیں کائیں کرتا کوا تھا۔ ریں ریں روتی گڑیا تھی۔ ناچنے والا بھالو تھا۔ اُچھلنے والا بندر تھا۔ رنگ برنگے غبارے تھے اور کیا کچھ نہیں تھا۔ چھوٹے بڑے بچے شہد کی مکھیوں کی طرح جیسے پھولوں پر منڈلا رہے تھے اور گود بھر بھر کے کھلونے لے کر قلقاریاں

مارتے ہوئے اُدھم مچا رہے تھے۔

ایک گول مٹول سرمئی رنگت کا تھلتھلا بچہ آیا اور دو سو روپے کی ایل۔ ایم۔ جی لے کر اسے بچوں پر تانتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ چند عورتیں اپنے بچوں کو ساتھ لے کر دکان پر آ گئیں اور ایل۔ ایم۔ جی کا مول بھاؤ کرنے لگیں۔ بھاؤ سن کر کچھ تو اپنے بچوں کو گھسیٹتی ہوئی گھر لے گئیں اور کچھ نے بال ہٹ کے سامنے ہتھیار ڈال کر ایک ایل۔ ایم۔ جی، تین کلاشنکوف اور چار پستول خرید کے بچوں کو دے دئے۔ وہ اچھلتے شور مچاتے اِدھر اُدھر دوڑ پڑے۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کئی اور مرد عورتیں بچوں کو لے کر دوکان پر آ گئیں اور اسلحے کی مانگ کرنے لگیں۔ اکثر نے مہنگے داموں ہی اسلحہ خرید کر بچوں کو دے دیا اور کچھ لوگ دق ہو کر بچوں کو پیٹنے گھسیٹنے لگے۔ جب وہ پھر بھی راضی نہ ہوئے تو انہیں کسی نہ کسی طرح بمبار جہاز اور ہیلی کاپٹر دے کر ٹرخا دیا۔

اس کے بعد ایک دھان پان سا بانس کی طرح گرہ دار بچہ آ گیا۔ اس کے دنبال میں تین بچے اور تھے۔ وہ دکان کے سامنے تھوڑی دیر سر ملائے مشورہ کرتے رہے کہ کیا خریدیں۔ اسلحہ خریدنا اُن کی قوتِ خرید سے باہر تھا، اس لئے وہ ایک تھرڈ کلاس پستول، ریل گاڑی، موٹر کار اور موٹر سائیکل لے کر با دلِ ناخواستہ مطمئن ہو کر چلے گئے۔ پھر کچھ نسبتاً چھوٹے بچے آ گئے جن کی اکثریت کی ناک سے رینٹ بہہ رہی تھی اور وہ اسے سڑکتے ہوئے کھلونوں کا بھاؤ تاؤ کرنے لگے۔ ہر کوئی بضد تھا کہ وہ لازماً اسلحہ ہی لے گا۔ کچھ نے تو لے بھی لیا لیکن کچھ چڑیا، بھالو، بندر، گڑیا اور غبارے پر گزارہ کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ پھر جیسے تبرکاً انہوں نے کچھ پٹاخے خرید لئے اور اِدھر اُدھر انہیں چھوڑ کر دھوئیں کے مرغولے بلند کرتے رہے۔

خرید و فروخت کے اس عمل کو چھ سال کا ایک بچہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

اس کے سنہرے گھنگھریالے بالوں کے نیچے اُس کا گورا کتابی چہرہ کبھی خوشی سے چاند کی طرح دَمکتا اور کبھی حسرتوں کے بادلوں کے پیچھے چھپ کر ماند پڑ جاتا۔ کھلونوں کو دیکھ کر وہ کبھی دھیرے سے مسکراتا تو اس کے چھوٹے چھوٹے موتیوں جیسے تراشیدہ دانت سورج کی شعاعوں سے جگمگا اُٹھتے اور اس کی چھوٹی سی ستواں ناک کے نقرئی نتھنے پھڑکنے لگتے۔ کبھی وفورِ مسرت سے اس کا چہرہ کھل کر گلنار ہو جاتا اور کبھی یکا یک غریب کے چراغ کی طرح بجھ جاتا۔ اس کے کپڑے بہت معمولی تھے لیکن اس کی معصوم وجاہت انہیں دمکا رہی تھی۔ اس کی اس رنگ بدلتی کیفیت کو دیکھ کر مجھے آوارہ بادلوں کا وہ تہہ بر تہہ سفید ٹکڑا یاد آ گیا جو آسمان کی نیلی وسعتوں میں ہواؤں کے نرم تھپیڑے کھا کر پل پل صورت تبدیل کرتا رہتا ہے۔ یک لخت میں نے محسوس کیا کہ اس ٹکڑے۔ نے کسی عفریت کی سی صورت اختیار کر لی اور گھر کی طرف دوڑ لگائی۔ چند منٹ کے بعد وہ اپنی ماں کو گھسیٹتا ہوا لایا اور اس کے سر کی میلی اوڑھنی کھینچ کر چیختے ہوئے اصرار کرنے لگا: ”مجھے ایل۔ ایم۔ جی چاہئے، مجھے ایل۔ ایم۔ جی چاہئے!“ لیکن وہ بے چاری اسے کیسے سمجھاتی کہ ساڑے چھ سال پہلے تو ایل۔ ایم۔ جی نے ہی تو اُس کے سہاگ کو خون کے تالاب میں لمبا لمبا لٹا دیا تھا اور اب وہ بے مروّت لوگوں کے درمیان بیوگی کا پہاڑ سر پر اٹھائے زمین پر رینگ رہی تھی !!!

⁂

۴۲. دریائے زندگی

یادیں تلخ بھی ہوتی ہیں، تُرش بھی ہوتی ہیں اور شیریں بھی۔ لیکن بچپن کی یادیں صرف شیریں ہوتی ہیں۔ کہیں تلخی تُرشی کا شائبہ ہو تو وہ تلچھٹ کی طرح تہہ نشیں ہو جاتا ہے۔ بچپن ہی میں، میں ے پڑھا تھا ع

بے کاری بڑی بیماری ہے

میری سمجھ میں قطعی نہیں آیا تھا کہ بے کاری بیماری کیسے ہو سکتی ہے جب کہ اس صورت میں انسان کے پاس فراغت کی وافر مقدار ہوتی ہے جس کو وہ اپنے من پسند طریقے سے صرف کر سکتا ہے۔ وہ چاہے تو صبح کو بستر سے ہی نہ اُٹھے اور دس بجے تک میٹھی نیند کے مزے لیتا رہے۔ جب اٹھے تو کھا پی کر دن بھر یا تو فاختاؤں بلبلوں کے بچے گھونسلوں سے اُتارتا رہے یا کبڈی اور گلی ڈنڈا کھیلتا رہے۔ پھر میں

نے لڑکپن میں پڑھا۔

بے کار مباش کچھ کیا کر
کپڑے ہی پھاڑ اور سِیا کر

میں زبردست حیران ہوا تھا کہ کسی آدمی کے پاس کام نہیں ہے تو اگر وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر سیتا رہے گا تو اس طرح سے اُس کا لباس برباد ہو جائے گا اور دوم سوئی دھاگے کی قیمت کے طور پر بھی گرہ سے پیسہ خرچ کرنا پڑے گا جو ایک بے کار آدمی کے پاس یا تو ہوگا ہی نہیں اور ہوگا بھی تو اتنا قلیل کہ وہ بے کار کی چیزیں خریدنے پر نہیں لٹائے گا۔ پھر لڑکپن میں پڑھا : Idle man's brain is devils workshop

(بے کار آدمی کا دماغ شیطان کا ورک شاپ ہوتا ہے)

میں نے اس پر بھی غور کیا تھا، بلکہ سر بھی کھپایا تھا، لیکن یہ کہہ کر اس مقولے کو مسترد کیا تھا کہ سنیٹوں، پارلیمنٹوں، اسمبلیوں کے ہوتے ہوئے شیطان صاحب کو بے کار انسان کے بوسیدہ دماغ میں گھس کر رات دن کھٹ پٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے!؟...... لیکن جب میں بذاتِ خود ایک سال تک بے کار رہا تو یہ بات منکشف ہوگئی کہ بے کاری سب سے بڑی بیماری ہی نہیں، سب سے بڑی لعنت بھی ہے۔

بے کاری دورِ حاضر کا سنگین مسئلہ ہے اور اس کا جنم داتا ہمارا نظامِ تعلیم ہے۔ ہمارے نظام ہی نے ہمارے سامنے یہ تصور کھڑا کر دیا کہ انسان کو میٹرک، بی۔ اے، ایم۔ اے کر کے سرکاری نوکر ہونا ہے اور جو سرکاری نوکر نہیں وہ 100 کام رکھنے کے باوجود بے کار ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ جوان نوجوان اپنا حاصلِ حیات فائلوں میں دبائے کورٹ کچہریوں، فوٹو گرافروں کی دکان، فوٹو سٹیٹ مرکزوں، کمپیوٹر سنٹروں، پولیس تھانوں، دفتروں، ایم۔ ایل۔ اے حضرات کے

گھروں یا سرکاری رہائش گاہوں، منسٹروں کے دروازوں کا طواف کرتے ہوئے صبح سے شام کرتے رہتے ہیں۔ رات گئے گھر لوٹ کر سارا غصہ ماں باپ، بھائی بہن، عزیزوں، رشتے داروں پر اُتار کر اپنے وجود کے اندر دہکتی ہوئی فرسٹریشن کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ کوئی نصیبوں سے شادی شدہ ہو تو بیوی بچوں کی صورت میں اسے ایک آسان ہدف (Soft Target) مل جاتا ہے۔ لاوا چونکہ ایک حد تک ہی پکتا رہتا ہے، اس لئے جب زمین پھاڑ کر باہر آجاتا ہے تو گجرات کی طرح کے کریہہ المنظر اور بھیانک نقوش زمین پر رقم کرتا ہے۔ انسانی ذہن کے اندر پکنے والا ''لاوا'' زمین کے لاوے سے زیادہ طاقتور اور تباہ کن ہوتا ہے۔ زمین کا زلزلہ فقط اپنے مرکز کے قریب پھیلے ہوئے علاقے کو مسمار کرتا ہے لیکن انسانی ذہن کا زلزلہ عالمگیر تباہی لاتا ہے اور اس کے اثرات بڑے ہی دیرپا اور دوررَس ہوتے ہیں۔ آج سیاست دانوں کو سیاسی ریشہ دوانیوں سے ہی فرصت نہیں اس لئے وہ اس فنابدوش مسئلے کا حل کیا ڈھونڈیں گے! اس لئے آج کے انسان کو اپنی زندگی کا مقصد خود متعین کرنا ہے اور وسائلِ روزگار خود تلاش کرنے ہیں...... زندگی بھی ایک بہتا ہوا دریا ہے اور کوئی بھی بہتا دریا اپنا راستہ ہمیشہ خود بناتا ہے، چاہے اس کے آگے ماؤنٹ ایوریسٹ ہی کھڑا کیوں نہ ہو!!!

* * *

۴۳. تکلا غنی

اُن دونوں اساتذہ کرام کا نام ایک ہی ٹرانسفر لسٹ میں یکے بعد دیگرے تھا اور دونوں ہی کو وادیٔ کشمیر سے خطہ لداخ کے لئے ٹرانسفر کیا گیا تھا جسے مقامی طور پر کسی بھی ملازم کے لئے بدترین سزا تصور کیا جاتا ہے۔ دونوں ہی لداخ جانے پر آمادہ نہیں تھے لیکن ایک کی نا آمادگی کی وجہ اس کی مجبوری تھی اور دوسرے کی نا آمادگی کی وجہ اُس کا سیاسی اثر ورسوخ تھا۔ دونوں نے عرضیاں لکھیں اور ڈائریکٹر اسکول ایجوکیشن کے دفتر کے باہر چوبی بینچ پر بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگے تاکہ اندر جا کر اپنی عرضیاں گزار سکیں۔ پہلے نے اندر قدم رکھ لیا اور اپنے پیچھے آہستہ سے دروازہ بند کرتا ہوا ڈائریکٹر صاحب کی میز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر سلام کر کے انتہائی شائستہ انداز میں اپنی درخواست ان کی میز پر رکھی۔ صاحب

نے نظر اُٹھائے بغیر اپنی ریوالونگ چیئر کو دائیں سے بائیں حرکت دیتے ہوئے پُروقار لہجے میں پوچھا: ''یس؟!''

''سر! مجھے لداخ تبدیل کیا گیا ہے لیکن خانگی حالات کی ابتری مجھے وہاں جانے کی اجازت نہیں دے رہی ہے۔ گھر میں بوڑھے والدین کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ دونوں صاحبِ فراش ہیں اور نگہداشت کے محتاج ہیں۔ اگر مجھے وادی ہی میں ایڈجسٹ کیا جائے تو نوازش ہوگی۔ میں بھی بچ جاؤں گا اور میرے علیل والدین بھی! اور جب میں ذہنی طور سے آسودہ ہوں گا تو زیادہ بہتر کام کرسکوں گا!''۔

''دیکھو! نوکری اور گھریلو ذمہ داری ایک ساتھ نہیں چل سکتی۔ یا تو نوکری کرو یا گھر سنبھالو۔ جاکے آج ہی سکول سے ریلیو (Relieve) ہوجاؤ اور جوائننگ ٹائم ختم ہونے سے پہلے لیہہ میں رپورٹ کرو۔ بصورت دیگر سبکدوش ہوجاؤ اور گھر بیٹھ رہو''۔

''سر! میری سبکدوشی سے محکمے کا نقصان ہوجائے گا۔ میں ایم۔ اے گولڈ میڈلسٹ ہوں۔ بی ایڈ میں بھی میں نے پہلی پوزیشن حاصل کرلی تھی۔ میری بہترین خدمات کے لئے مجھے سرکار نے ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔ درس وتدریس پر میں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ مجھے وادی میں کسی جگہ تعینات کیا جائے تو ایک اچھا ٹیچر بھی بچ سکتا ہے اور محکمہ تعلیم بھی!''۔

''دیکھو! میرے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہیں۔ کرنے کے بہت سارے کام سامنے دھرے ہیں۔ رہی تمہاری گولڈ میڈلسٹ، فرسٹ پوزیشن ہولڈر اور اعزاز یافتہ ہونے کی بات، تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ کتنے ہی لوگ گولڈ میڈل سینے پر سجائے بس سٹاپوں پر ٹھیلے لگاتے ہیں۔ اس لئے جاؤ اور مجھے کام کرنے دو''۔

''لیکن سر......!!''

''آوَٹ''...... ڈائریکٹر صاحب نے آنکھیں چندھیاتے ہوئے دایاں ہاتھ ہوامیں لہرایااور وہ اُستاد آوَٹ ہوگیا۔ اس کی پیشانی عرق آلود تھی۔

دوسرِے اُستاد نے اندر قدم رکھا اور دروازہ بھیڑنے کی بھی زحمت نہ اٹھاتے ہوئے درخواست ''صاحب'' کی میز پر اُچھال دی اور کرسی پر براجمان ہوا۔ صاحب نے نظر اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور پوچھا: ''یس!''

''جناب! آج تک تو میں نے اندھوں کو فٹ پاتھوں پر بھیک مانگتے دیکھا تھا لیکن آج پہلی بار انہیں دفتروں کی کرسیوں پر بیٹھ کر آرڈر جاری کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں!''

''کیا مطلب!؟'' ڈائریکٹر صاحب ہڑ بڑا کر بولے۔

''مطلب یہ کہ کیا آپ کی چشمانِ مبارک میں واقعی اتنا نور نہیں کہ آپ آرڈر جاری کرنے سے پہلے یہ دیکھ سکیں کہ کسی استاد کو وادی سے لداخ تبدیل کرتے ہوئے کتنی قیامتیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ آپ نے ''رقعہٗ شریف'' جاری کیا اور سمجھ لیا کہ میں نے لیہہ (لداخ) میں جوائن کرلیا! سنئے! ابھی وہ ڈائریکٹر ایجوکیشن پیدا ہونے کے انتظار میں ہے جو غنی کو ڈِس لوکیٹ (Dislocate) کرکے لداخ بھیج سکے!!''۔

''اے مسٹر! آپ کو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میں کون ہوں؟!''

''مجھے نہ صرف بات کرنے کی تمیز ہے بلکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کس سے کس طرح بات کی جائے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اونٹ کو پہاڑ کے نیچے لاکر کس طرح اپنے قد کا احساس دلایا جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ آپ کون ہیں تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ سوکھا قلم گھسنے والے کلرک سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ میرے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ آپ کو صرف ایک ٹیلی فون سے کرسی سے اُٹھا

کرسڑک پر بٹھا سکتا ہوں!''۔

''کیا آپ مجھے اپنی پہنچ سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں یا مجھ سے ٹکر لینا چاہتے ہیں!؟''

وہ اُستاد کرسی سے کھڑا ہوگیا اور عین ڈائریکٹر صاحب کی سیدھ میں آکر اپنے سر سے سُرمئی قراقلی ٹوپی اٹھائی۔ رکوع کے انداز میں جھکا اور اپنی گنجی چاند کو دائیں ہاتھ سے پیہم ''ٹھک ٹھک'' بجاتے ہوئے اونچی آواز میں چلّایا:

''تم ٹکر لینے کی بات کرتے ہو؟ یہ دیکھو یہ، میری گنجی کھوپڑی۔ اس کے بال لوگوں سے ٹکر لیتے لیتے ہی اُڑ گئے ہیں۔ جانکار لوگ مجھے ''تکلاغنی'' کہتے ہیں۔ اس گنجی کھوپڑی کی ٹکر جان لیوا ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی ٹکر برداشت کرنے کیلئے تیار ہو جاؤ اور ہو سکے تو اپنے آپ کو بچالو۔ میں ہر مدِمقابل کو اپنا دفاع کرنے کا موقع ضرور دیتا ہوں''!

میرا خیال تھا کہ اب وہ مینڈھے کی طرح دس قدم الٹے پاؤں پیچھے ہٹے گا اور پھر یک لخت آگے بڑھ کر صاحب کے سر پر ٹکر مارے گا اور اس کا سر کچے ناریل کی طرح پاش پاش ہو جائے گا۔ لیکن وہ حیرت انگیز پھرتی سے پلٹ کر باہر نکلا اور پیچھے ''پٹاخ'' سے دروازہ بند کرلیا۔ ڈائریکٹر صاحب دو اُنگل منہ پھاڑے کبھی دروازے کو اور کبھی اپنی دائیں جانب بیٹھے ہوئے پی۔ اے کو دیکھنے لگے جسے معلوم ہی نہیں تھا کہ تکلاغنی منسٹر صاحب کے برادرِ نسبتی کا ہم زُلف تھا۔ دوسرے دن ایک استاد نے استعفیٰ پیش کیا اور دوسرے نے اپنی ڈیوڑھی سے سو قدم کی دوری پر واقع سکول میں جوائن کیا۔

* * *

۴۴. کرو یاد

آج روز و شب یہی سننے کو ملتا ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم تباہ ہو چکا ہے۔ کون زندیق کہتا ہے کہ تباہ نہیں ہو چکا ہے لیکن کیا علاج یہی ہے کہ اس کا میڈیا اور دوسرے ذرائع ابلاغ پر ڈھنڈورا پیٹا جائے یا علاج یہ ہے کہ اس کی تعمیرِ نو کے لئے عملی اقدامات کئے جائیں۔ ویسے لال بجھکڑوں نے کئی اقدامات کئے بھی لیکن ان کا نتیجہ چونکہ ڈھاک کے تین پات نکلتا تھا، سو نکل گیا۔ بھلا طریقۂ امتحانات کو بدل کر سی۔سی۔ای (Contineous Comprehensive Evaluation) کر دینے، این۔سی۔ای۔آر۔ٹی (National Council of Education Reserach and Training) کے طویل و عریض نصاب کو تھوپنے اور پرائیوٹ سکولوں پر غیر جمہوری قسم کی پابندیاں لگانے سے بھی ایسے

گھمبیر مسئلے کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے؟! میرے خیال میں حکومت کو یہ احساس اچھی طرح سے ہو چکا ہے کہ یہاں کا نظامِ تعلیم دم توڑ چکا ہے لیکن پھر بھی عوام الناس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے مُردے کے منہ پر آکسیجن ماسک چڑھا رہی ہے اور وہ بھی ایسا جس کے پائپ کا کسی بھی آکسیجن سلنڈر سے رابطہ نہیں۔ بجائے اس کے کہ سرکار پرائیوٹ سکولوں پر طرح طرح کے قدغن لگائے، اسے انتہائی فراخ دلی اور حقیقت پسندی سے اس امر کو تسلیم کرنا چاہئے کہ یہاں نظامِ تعلیم کا گدھا مر چکا ہے اور اس کے بے جان قالب میں ہوا پھونکنا ایک مضحکہ خیز عمل ہے۔ اسے سرکاری سکولوں کے ٹیچنگ اور نان ٹیچنگ سٹاف کو روزگار کا کوئی متبادل وسیلہ فراہم کر کے اس بدنصیب قوم پر احسانِ عظیم کرنا چاہئے۔ اگر حکومت شعبۂ تعلیم کو کلی طور پر پرائیوٹ سیکٹر کے حوالے کر کے خود لاتعلقی سے دور بیٹھ جائے ،تو بے شمار بچوں کی زندگیاں اب بھی تباہ ہونے سے بچ سکتی ہیں۔ کسی کو میرے خیال میں شدت پسندی نظر آئے تو مہربانی کر کے مندرجہ ذیل دو سچے واقعے غیر جانبداری سے پڑھے اور کوئی فیصلہ سنائے: (دونوں واقعات اکیسویں صدی کے ہیں)۔

ایک سرکاری سنٹرل سکول میں ماسٹر جی نے ایک فقید المثال انعامی مقابلہ منعقد کیا۔ جناب! کرکٹ، فٹ بال، والی بال، مضمون نویسی، بیت بازی، جنرل نالج کوئز وغیرہ کا نہیں بلکہ ”تھوک بازی“ کا۔ یعنی Spitting Competition حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ دراصل ماسٹر جی نے ایک دن کے لئے غیر حاضر رہنے والے بچے کو کلاس کے سامنے کھڑا کر دیا اور اعلانِ عام فرمایا: ”بچو! باری باری پانچ قدم کی دوری سے اس کے چہرے پر پانچ بار ”آخ“ سے تھوکو۔ جس بچے کے پانچوں تھوک اس کی ناک پر لگیں، وہ مبلغ پانچ روپے کا انعام پائے گا اور وہ بھی ضربِ ڈبل!!“ پھر بچے ایک ایک کر کے ہدف پر تھوکتے گئے۔ اس پھول

سے بچے کا گلابی چہرہ غلاظت سے بھر گیا۔ وہ بے چارہ نہ تو رو سکا اور نہ بھاگ سکا۔ شاید اس لئے کہ تذلیل کی آخری سرحد پر بنی آدم کے جذبات یخ بستہ ہو جاتے ہیں!!

یکم مارچ کو اڑھائی ماہ کی تعطیلات کے بعد سکول کھلے تو اس بچی کی جیسے عید ہو گئی۔ سکول جانے سے وہ بچے گھبراتے کتراتے ہیں جو ''نا قابل'' ہوں۔ جو بچی پرائیوٹ سکول میں نرسری سے پانچویں کلاس تک پچانوے فیصد سے زیادہ نمبرات حاصل کر کے کامیاب ہوتی رہی ہو، اُس کا دل سکول سے باہر لگ ہی نہیں سکتا۔ جب وہ گورنمنٹ ہائی سکول سے چار بجے لوٹی تو اس کے دادا جی نے اس سے پہلا سوال یہ کیا:

''بیٹی! آج سکول میں کیا کیا پڑھا؟''

''جی، کچھ بھی تو نہیں!!''

''کیا؟'' دادا جی نے حیرانی سے کہا

''جی، بالکل کچھ نہیں!!''

دادا جی یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ سکول چونکہ ڈھائی ماہ کی سرمائی تعطیلات کے بعد کھلے ہیں اس لئے اساتذہ کرام اور استانیاں ایک دوسرے کو داغ ہائے مفارقت کی جگر خراش داستانیں سناتے رہے ہوں اور انہیں کلاس میں جانے کی فرصت نہیں ملی ہوگی۔ دوسرے دن دادا جی نے اشتیاق سے پوچھا: ''بیٹی، کیا کیا پڑھا آج؟؟''

''جی کچھ نہیں!''

''پھر اساتذہ دن بھر کیا کرتے رہے!؟''

''جی، دو استانیاں اور دو اساتذہ کرام چند لمحوں کے لئے کلاس میں آئے ضرور لیکن بس صرف یہ کہا کہ ''یاد کرو'' اور چلتے بنے!!''۔

پھر بچی ہر روز ‘‘یاد کرو’’ اور ‘‘کرو یاد، کرو یاد’’ کی گردانیں دوہراتی رہی یہاں تک کہ 9 مارچ کا یومِ سیاہ قریب الختم تھا۔ جب اس روز بھی بچی نے ‘‘کرو یاد، کرو یاد’’ کی گردان دوہرائی تو دادا جی کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اسے رونے کے بجائے افسرانِ بالا کے پاس جانا چاہیئے تھا لیکن وہ چونکہ اپنی کرسیوں کے ساتھ ‘‘فیوی کول’’ سے چپکے ہوئے ہیں، اس لئے جہاں بھی جاتے ہیں، کرسی اُن کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ نتیجے کے طور پر وہ کرسیوں کو توڑ پھوڑ سے بچانے کی خاطر اپنے دفتروں سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ کبھی مجبوری سے نکلتے ہیں تو انہیں قدم قدم پر پیچھے مُڑ مُڑ کر کرسی کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ لاچار ہو کر دادا جی نے قسم کھائی کہ وہ پیٹ پر پتھر باندھے گا لیکن آئندہ برس بچی کو ضرور پرائیوٹ سکول میں داخل کرے گا!۔

* * *

۴۵. اپنی جنگ

دورِ جدید کا نوجوان زندگی کے آگے ایک بہت ہی بڑے سوالیہ نشان کی طرح کھڑا ہے۔ کتابِ زندگی کی دوسری علامتوں عبارتوں کی طرف انسان کی نظر بھلے ہی نہ اُٹھے، لیکن یہ سوالیہ نشان اُسے ہر حال میں اپنی طرف متوجہ کرر ہا ہے۔ اب جو چیز اتنی جاذبِ توجہ ہو، اس کے وجود کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بالفرض محال، کیا بھی جائے لیکن زیادہ دیر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ نوجوان اپنے وجود کی، غائت سے چونکہ واقف نہیں، اس لئے اُمید بھری نگاہوں سے اپنے بزرگوں کی اور دیکھ رہا ہے کہ شاید ان کے پاس اس کے مہمل وجود کو معنی پہنانے کے لئے کوئی راستہ ہو۔ لیکن یہاں وہ یہ بات بھول رہا ہے کہ وہ جن کی طرف امید سے دیکھ

رہا ہے، وہی لوگ اُس کی نظر میں ایک عضوِ معطل سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور جو عضو معطل ہو، اس کا جسم کے ساتھ پیوستہ ومنسلک ہونے کے باوجود کوئی مقام نہیں ہوتا۔ اس لئے اسے یا تو کسی مناسب وقت پر کسی تجربہ کار جراح کی مدد سے الگ کر دیا جاتا ہے یا بہ امر مجبوری اپنی ذات کے ساتھ گھسیٹا جاتا ہے۔

آج کے یہ ''عضو معطل'' کہلانے والے لوگ جب جوانی کے جگری دوست تھے، تو ان کا بھی ہر طرف طوطی بولتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ آج کے نوجوانوں کی طرح ہی اپنے بڑے بزرگوں کی طرف رہنمائی ورہبری کے لئے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھتے رہے ہیں اور بزرگوں نے اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے ان کے اُلجھے راستوں کو سلجھا دیا ہے۔ حقیقت میں یہ مسئلہ فی زمانہ موجود ہوتا ہے اور بس ایک حل رکھتا ہے کہ بزرگ اپنے جانشینوں کے لئے جگہ خالی کریں اور انہیں اپنے ان تجرباتِ سے مستفید کریں جن کے حصول کے لئے وہ ساری زندگی تپتے سلگتے رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ نوجوان اپنے بزرگوں کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے سطحِ زمین پر وہ تحریر پڑھ لیا کریں جو فقط ناختوں سے رقم ہوتی ہے۔ لیکن حال برعکس ہو تو 11 ستمبر 2001ء کو ''ورلڈ ٹریڈ سنٹر''[1] عمارت کے ساتھ طیارے کا ٹکرانا غیر فطری عمل نہیں رہتا!

آج کے نوجوان کے پاس ''بغاوت'' کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں ہے جس کی مدد سے وہ زندگی کے عفریت کے دانت توڑ سکے۔ لیکن بغاوت صرف بحران پیدا کر سکتی ہے، بحران کو ٹال نہیں سکتی۔ ''بغاوت'' بھی ایک وقت نافع ہوتی ہے۔ اس خاص وقت پر جب یہ کامیاب ہوتی ہے تو ''انقلاب'' کہلاتی ہے۔ لیکن جب یہ اپنے وقت سے ہٹ کر لوگوں کا شعار بن جاتی ہے تو زندگی کے تانے بانے ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھ جاتے ہیں جن کو مشاق ہاتھ بھی سلجھانے سے قاصر رہتے ہیں۔ بغاوت کے اسی شعار نے آج کے نوجوان کو ایک ہمہ رُخی کراسنگ

(Crossing) پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سمتوں کا تعین کرنا اُس کے لئے ناممکن بن گیا ہے۔ تخریب کی جانب جانے والی راہ چونکہ اس کے قدموں سے زیادہ قریب ہے، اس لئے وہ سود وزیاں کی تمیز بھول کر اسی پر ہو لیتا ہے۔ کچھ آگے چل کر وہ لوٹنا چاہتا ہے لیکن راہ مسدود ہوتی ہے۔ پھر وہ کبھی نصیبوں سے لوٹ سکا تو ٹھیک وگرنہ راستے کا غبار بن کے رہ جاتا ہے جیسے آندھی کے جھونکے اپنی مرضی کے مطابق اِدھر سے اُدھر ڈھنکتے رہتے ہیں۔ اس لئے اگر آج کا نوجوان چاہتا ہے کہ اُسے منزل کے حصول کے لئے حتمی پروانہ مل جائے، تو اسے اپنے بزرگوں کی ہر بات سے اختلاف کرنے کے بجائے معقولیت پسند بننا چاہئے بصورت دیگر ہر بزرگ نصرت گوالیاری کے اس ''ہائیکو'' کی زبان سے یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ ؎

بیٹے کیوں ہو تنگ
تم بھی لڑ کر میری طرح
جیتو اپنی جنگ

* * *

۴۶. ماہِ نو

زندگی کسی ایک کیلئے بھی مہربان نہیں ہوتی، ہاں کسی کے حق میں ذرا موافق ہوتو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جانا چاہئے کہ اس کی چھاتیوں میں ماں کی طرح اس کے لئے دودھ اُتر آیا ہے۔ زندگی ہر انسان کو قدم قدم پر امتحانات سے دوچار کرتی رہتی ہے۔ ان میں فقط اہلِ دل ہی پورے نمبرات سے پاس ہوتے ہیں۔ رہے دوسرے اور تیسرے درجے میں کامیاب ہونے والے لوگ، وہ زندگی کے امتحانات میں بیٹھتے ہی کب ہیں! وہ بس تاک جھانک کرکے اپنا جواب نامہ (Answer-Sheet) بھر کر مطمئن ہونا کمال سمجھتے ہیں۔

اہل دل لوگ زندگی کے امتحانات میں سرخرو ہوتے ہیں لیکن اس سرخروئی کو

حاصل کرنے کے لئے انہیں کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، اسے بیان کرنا قلم وقرطاس کی دسترس سے باہر ہے۔ دوسرے تمام مراحل سے قطع نظر، اگر صرف اپنے مصائب کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کی انسانی خواہش ہی کو لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زندگی کے ''کھڑے'' پہاڑ پر اپنے ناخنوں سے قدم دھرنے کی جگہ بنا کر سینے کے بل رینگ کر اوپر چڑھنا کس قدر کارِفرہاد ہے۔ انسان فطری طور پر اس بات کا خواہشمند ہوتا ہے کہ اس کے محاسن کا تو خوب چرچا ہو لیکن معائب دوسروں پر آشکارا نہ ہوں اور اِدھر زندگی کے کارندوں کا اصرار ہے کہ وہ کسی بھی حال میں اس کے محاسن کو ابھرنے نہیں دیں گے، صرف اُس کے معائب ہی کا جشن منائیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجسمۂ محاسن تھے لیکن جب ''واقعۂ افک'' پیش آیا تو زندگی کے ہرکاروں نے آسمان کو کھینچ کر ان کے سر مبارک کے بالکل قریب کر دیا۔ ہندو شری رام چندر جی کو بھگوان کا اوتار تسلیم کرتے ہیں لیکن جب وہ لنکا ڈھانے کے بعد لوٹے تو زندگی کے ٹھیکیداروں نے انہیں سیتا جی کی ''اَگنی پریکشا'' لینے پر مجبور کر دیا اور وہ بول اٹھے ''رام دنیا میں کسی چیز سے نہیں ڈرتا سوائے بدنامی کے!!'' اب کوئی بدنام نہ ہونا چاہتا لیکن انسان تو نسیان اور خطاؤں کا مرکب ہے۔ اس لئے کسی نہ کسی جگہ اس کی خطاؤں کے اُبھرنے کے امکانات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ اندریں حالات ایک تو انسان کو کم سے کم غلطیوں کے صدور کے لئے کوشاں رہنا چاہئے اور دوم اپنی لوحِ جبیں کو غلطیوں کی تحریروں سے پاک وصاف رکھنے کی جدوجہد کرنا چاہئے کیونکہ دنیا والے اپنے گھروں سے باہر قدم رکھتے ہی آسمان کے بجائے دوسروں کے چہروں پر نظر ڈالتے ہیں تا کہ انہیں اُن حوادثات کی سُن گُن مل جائے جو اندر ہی اندر کسی کو تہہ وبالا کرتے رہتے ہیں...... تصور کیجئے کہ زیرِ زمین پانی کی پیداوار کو ناممکن بنانے کی کوشش کرنا اور پھر سطحِ زمین پر اس کے ظہور کو روکنا کتنا دِقت طلب اور جگر خراش عمل ہے۔ یہ عمل

چہرے اور ماتھے کو جھریوں سے بھر دیتا ہے۔ لیکن اہل دل لوگ پھر بھی شعوری طور پر کوشش کر کے ان جھریوں کو ”مہہِ کامل“ کے بجائے ”مہہ نَو“ بناتے ہیں جس کی نشاندہی بسا اوقات بڑی بڑی رصدگاہوں سے طاقتور دُوربینوں سے بھی نہیں ہوتی حالانکہ وہ اپنی تمام حقیقتوں کے ساتھ لوحِ آسماں پر رقم ہوتا ہے ؎

لوگوں کی نگاہوں کو پڑھ لینے کی عادت ہے
حالات کی تحریریں چہرے سے بچا رکھنا

⁂

۴۷. اعلان اور اخفا

انسان میں بیک وقت نیکی اور بدی دونوں قسم کے رُجحانات پنپتے رہتے ہیں۔ نیکی کا رُجحان اپنی طرف کھینچتا ہے اور بدی کا اپنی طرف۔ جس پر نیکی کا رُجحان غالب آ گیا وہ نیک اور جس پر بدی کا رُجحان غالب آ گیا وہ بد کہلاتا ہے۔ بہت ہی کم لوگ ہیں جو بدی کے رجحان کو مغلوب کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ اہل اللہ کہلاتے ہیں۔ لیکن بقول شاعر۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(ترجمہ:- یہ سعادت بزورِ بازو حاصل نہیں ہوسکتی جب تک نہ خدائے

بخشندہ کسی کو بخش دے)۔

کچھ لوگ ان رجحانات میں برابر رہتے ہیں۔ لیکن اللہ کی رحمت چونکہ اس کے غضب پر ہمیشہ حاوی اور غالب رہتی ہے، اس لئے قیامت کو ان کا برابر سرابر میں چھوٹ جانا کچھ بعید نہیں اگرچہ کوئی بھی اس کے لئے حتمی گارنٹی نہیں دے سکتا۔ اب جو لوگ نیکی کے رجحانات میں پائمال ہیں، وہی ہر دور میں انسانیت کے آگے سوال کے طور پر کھڑے رہتے ہیں۔

نیکی کے رجحان میں پامال لوگ اپنی تمام تر بدی کے باوجود انسانیت کے لئے کم سے کم مسائل پیدا کر سکتے ہیں اگر وہ ہر وقت بدی کو امکانی حد تک اپنی ذات ہی کے دائرے میں محدود رکھنے کی شعوری کوشش کریں۔ اس طرح سے ان کے بدی کے رجحانات کو تشفی (Satisfaction) بھی ملے گی اور سماج اس کے منفی اثرات سے محفوظ بھی رہے گا۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو شراب کی لت پڑی ہوئی ہے اور وہ کوشش کے باجود اس دُخترِ تاک سے دامن نہیں چھڑا سکتا۔ وہ اگر شام کو کسی شراب خانے سے نشے میں دُھت ہو کر اِدھر اُدھر اُدھم مچانے کے بجائے خاموشی سے گھر کی تنہائیوں میں پیئے تو اُس کے پینے کی مضرت فقط اس کی اپنی ذات یا زیادہ سے زیادہ اُس کے اپنے گھر تک ہی محدود رہ سکتی ہے۔ کیونکہ گندگی ہمیشہ اُسی وقت زیادہ تکلیف دہ بن جاتی ہے جب اُسے شارع عام پر کریدا جائے۔ غلاظتِ گُشتہ اکثر غیر مؤثر ہی رہتی ہے...... یا ایک شخص مبتلائے عشق ہو جاتا ہے۔ عشق چونکہ ایک آفاقی اور عالمگیر حقیقت ہے، اس لئے اس کی اہمیت کو مانے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اب ایک عاشق اپنے محبوب سے گوشۂ عافیت یا کنج تنہائی میں مل کر بوس و کنار اور راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے تو کسی اُتھلے دل والے ٹوہ رکھنے کے عادی شخص کو ہی اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن یہی عمل اگر عاشقِ نامراد برسرِ منظر کرے تو نہ صرف بگاڑ کے امکانات روشن ہو جائیں گے بلکہ اعتراضات کی بھی

گنجائش نکل آئے گی۔

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اگر انسان ذرا سی محنت کر کے قرآنِ مجید میں تفکر کرے تو اسے صاف محسوس ہوگا کہ اللہ نے اپنے بندوں کی نفسیات اور فطرت کو کہیں پر بھی اپنی ہدایات کے پس منظر میں نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اللہ کی غائت ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے بندوں کو بات بے بات پکڑ لے اور معمولی لغزشوں کی پاداش میں انہیں عذاب وعتاب کا شکار بنا لے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بندہ بندگی کی حدود سے تجاوز کر کے باغی نہ بن جائے۔ جب بندہ علمِ بغاوت بلند کرتا ہے تو اللہ جال شانہ‘ اس کی سرکوبی کو ضروری تصور فرماتے ہیں۔ بدی کا برملا اظہار انسان کی مِجبوری نہیں ہے بلکہ اعلانِ بغاوت ہے۔ اس لئے جس مملکت میں کوئی شخص یہ اعلان کرے، اُس کے فرمان روا کے لئے اُس کی گوشمالی کرنا لازم بن جاتا ہے۔

ارشادربانی ہے:

”کیا تم ایسے بگڑ گئے ہو کہ دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے فحش کاری کرتے ہو؟“ (النحل) گویا فحش کاری اور بدکاری اُسی وقت ”انتہائی“ قابل مواخذہ بن جاتی ہے جب اس کا ارتکاب اخفا کے بجائے اعلان کے ساتھ ہونے لگے!!

⁂

۴۸. غائتِ صلوٰۃ

میں نے نمازیں پڑھنے کا ایسا حیرت انگیز اہتمام اور اس کے مُلحقات کا بے مثال تزک واحتشام کبھی نہیں دیکھا ہے جیسا دورِ حاضر میں نظر آرہا ہے۔ قدم قدم پر عالیشان مسجدیں کھڑی ہیں اور لوگ جوق در جوق ان میں سجدہ ریز ہوتے رہتے ہیں۔ واعظینِ کرام حلق کے بل چلاّ چلاّ کے وعظ فرماتے ہیں اور خاص وعام سر دُھنتے ہوئے ان کے ایک ایک لفظ کی تائید وتصدیق کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود لوگوں میں کردار وعمل کی صلابت دُور دور تک نظر نہیں آتی۔ بس انحطاط ہی انحطاط زندگی کے سمندر میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

نماز کردار سازی کا اسلامی ضابطہ ہے اور نماز کی تاکید قرآنِ مجید میں اتنے

مقامات پر وارد ہے کہ تکرار حیرت افزاء معلوم ہوتی ہے۔ لوگ نماز پڑھتے ہیں لیکن ان کے کردار کی تعمیر نہیں ہوتی ۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ لوگ نماز پڑھتے ہوئے بھی نماز نہیں پڑھتے ۔ اب جو لوگ نماز پڑھتے ہوئے بھی نماز نہیں پڑھتے تو وہ راست طور سے ایک تو نماز پڑھنے کے مقصد سے بے خبر ہیں اور دوم اُن آیات و الفاظ کے مفاہیم سے ناواقف ہیں جن کا ورد وہ نمازوں کے دوران میں کرتے رہتے ہیں ۔ شاید انہی لوگوں کے لئے قرآن مجید کا ارشاد ہے: ''تباہی ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہوتے ہیں'' ۔ (الماعون ۔ ۴،۵) اگر لوگ ان الفاظ و آیات کے مفاہیم سے واقف ہیں لیکن ان میں دئے گئے احکامات کی پابندی ضروری خیال نہیں کرتے تو اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ قرآن پر سرے سے ایمان ہی نہیں لائے ہیں اور جو شخص قرآن پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کو معقولیت سے خود ہی یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ اسے مسلمان کہنا صحیح ہے یا غلط! ارشاد نبویؐ ہے: ''قرآن پر ایمان نہیں لایا وہ شخص جس نے اس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر لیا'' ۔ (ترمذی شریف ، بروایت صہیب رومی) جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اسے مانتا ہے پھر مان کر اس کے احکامات کی خلاف ورزی کرتا ہے، اسی کے خلاف قرآن مجید حجت بن جاتا ہے ۔ ارشاد نبویؐ ہے: ''قرآن حجت ہے تیرے حق میں یا تیرے خلاف'' ۔ (مسلم)

بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ جس کی نماز انسان کا تزکیہ نہیں کرتی ، اُس کی نماز قطعی طور پر نماز نہیں ہے ۔ ایسے شخص کی مثال ، بقول ایک جیّد عالمِ دین کے ، ایسی ہے کہ ایک آدمی غذا تو کھاتا ہے لیکن کھانے کے فوراً بعد قے کر دیتا ہے اور پھر شکایت کرتا ہے کہ اس میں تغذیہ نہیں ہے ، جس کی وجہ سے اُس کے جسم کی مناسب نشو و نما نہیں ہوتی ۔ قرآن و نماز فی نفسہٖ وہ غذا ہیں جو انسانی کردار کی تعمیر کرتی ہیں لیکن جو انہیں پڑھ کر اپنی روح میں سمونے کے بجائے زینتِ طاق

نسیاں بنادیتا ہے، اُس کا یہ کہنا سراسر غلط۔ ہے کہ قرآن ونماز سے اس کے کردار کی تعمیر نہیں ہوتی۔ فرمان نبویؐ ہے:

"جسے اُس کی نماز نے فحش اور بُرے کاموں سے نہ روکا، اس کی نماز، نماز نہیں ہے"۔ (ابن ابی حاتمؒ)

"جس کی نماز نے اسے فحش اور برے کاموں سے نہ روکا، اس کی نماز نے اُسے اللہ سے اور زیادہ دور کردیا"۔ (ابن عباسؓ)

* * *

۴۹. باوزن

اظہارِ فخر ومباہات کے لئے تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں مختلف ذرائع رہے ہیں۔ جب انسان ابھی ترقی یافتہ زندگی سے آشنا نہیں تھا، وہ اپنی افرادی قوت پر فخر کرتے ہوئے ''کثرت تعداد'' دکھا کر لوگوں کو مرعوب کرتا پھرتا تھا۔ جوں جوں وہ شاہراہِ زندگی پر آگے بڑھتا گیا، ان چیزوں نے طرح طرح کے روپ دھار لئے۔ مقدارِ اراضی، وسعتِ باغات اور دوسری چیزوں کو اس کی عام اور سادہ صورت کہا جاسکتا ہے۔ ماضی قریب میں باغ ہائے ثمردار اس اظہار کی نمایاں شکل رہی ہے۔ یعنی جس کا جتنا بڑا باغ، اُس کی اتنی ساکھ اور دھاک۔ لیکن جب سے یہاں فروٹ انڈسٹری ناتجربہ کار اور مجہول قسم کے لوگوں کے ہاتھوں میں آنے کی وجہ سے زوال آمادہ ہوگئی، باغوں کے کریز نے چولا بدلا ہے۔ اس چولے کا نام

''گاڑی'' ہے۔ یعنی جس کے پاس موٹر کار ہے وہ ''انسان'' ہے اور جس کے پاس نہیں ہے وہ انسان ہوتے ہوئے ''بے کار'' ہے۔

بہت دن ہوئے میں نے ایک فلم دیکھی تھی۔ فلم میں دو بھائیوں نے اپنی افتادِ طبع کے مطابق دو متضاد پیشے اختیار کر لئے۔ ایک ایماندار پولیس افسر بن گیا اور دوسرا اسمگلر۔ ظاہر ہے کہ ایماندار پولیس افسر سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن رئیس نہیں ہو سکتا اور سمگلر سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن غریب نہیں ہو سکتا۔ حسن اتفاق سے ان کی بیوہ ماں پولیس افسر کے ساتھ رہتی تھی اور سمگلر بیٹے کا منہ تک دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ ایک دن جب دونوں بھائیوں کی ایک خاص سچویشن میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے ''بہت ڈائیلاگ مارے''۔ اور اپنی اپنی شان کا اظہار کیا۔ آخر میں سمگلر بھائی نے اُسی طرح کا مکالمہ استعمال کیا جو ہر دور کا امیر غریب کے خلاف بولتا رہا ہے۔ یعنی ''میرے پاس زمین ہے، جائیداد ہے، بنگلہ ہے، گاڑی ہے، نوکر چاکر ہیں، بینک بیلنس ہے، اثر رسوخ ہے..... تمہارے پاس کیا ہے!؟؟'' اس پر پولیس افسر بھائی ٹھہرے ہوئے فلمی انداز میں بڑی استقامت سے جواب دیتا ہے کہ ''میرے پاس ماں ہے!!''

ایک کاربردار سمگلر کی، جس کا فی الوقت وادی کشمیر میں طوطی بول رہا ہے، ایک سائیکل سوار ماسٹر جی سے ٹھن گئی۔ نہ جانے کس بات پر۔ (یہ ماسٹر لوگ بھی بڑے ہی منطقی قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ نہیں مانتے کہ ان کے پاس کوئلے کے بازار میں اُجلے کپڑوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔) اس نے حیل و حجت سے کام لیتے ہوئے سمگلر کو چت کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کی زبان درازی سے اور زیادہ مشتعل ہو کر کہنے لگا:

''ابے او ماسٹر! میرے پاس چھ بنگلے، دس گاڑیاں، سو نوکر، چار کارخانے، پانچ باغ، اثر رسوخ اور عیش و عشرت کے ہر سامان کے علاوہ تمہاری جتنی تنخواہ پانے

والے ایکس بندوق بردار ہیں۔ تمہارے پاس کیا ہے؟ یہ کھٹارا سائیکل، جس کی کاٹھی بھی اُدھڑی ہوئی ہے!"۔

"میرے پاس ایمان ہے......" کٹ حجت ماسٹر جی نے فلمی انداز میں کہا۔

"جو آج ہر گلی کے نکڑ پر ٹکے سیر بکتا ہے!" ایک راہ گیر نے ماسٹر جی کا جملہ پورا کرلیا...... وہ شاید نہیں جانتا تھا کہ ایمان نہیں بکتا بلکہ ایمان کا دھندہ کرنے والا دلال بکتا ہے جس کی خواہشات نفس کی چھلنی میں اتنے چھید ہوتے ہیں کہ کوئی بھی شئے اُسے نہیں بھر پاتی اور وہ ساری عمر مر بھُکوں کی طرح "جھوٹی بھوک" سے بلبلاتا رہتا ہے۔

⁂

۵۰. خطِ افلاس کے نیچے

ایک انتہائی معمولی اور غیر اہم بات کو لے کر ایک بستی میں لوگوں کے دو دھڑے بن گئے اور بہت دنوں تک تناؤ اور خلفشار بنا رہا۔ اقدامِ اوّل کے طور پر ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت بند ہوئی۔ لوگوں کا ایک دوسرے سے سامنا ہو جاتا تو سر جھکائے گزر جاتے اور کدورت کسی پہاڑی بادل کے ٹکڑے کی طرح ان کے چہروں پر چھا جاتی کہ ابھی ابھی دھوپ تھی اور ابھی سایہ ہو گیا۔ اقدامِ دوم کے طور پر لوگوں نے ایک دوسرے کے گھر جانا چھوڑ دیا۔ سخت ضرورت پڑتی تو اس طرح جاتے جیسے میکے کی جانب بھاگی ہوئی بہو مدتِ دراز کے بعد سسرال کے آنگن میں قدم رکھتی ہے کہ نہ جانے سواگت کیسے ہو! اقدامِ سوم میں ایک دوسرے کے ساتھ مقاطعہ کیا گیا۔ ایک دھڑے کے پاس میڈیکل شاپ تھا تو اس نے دوا

فراہم کرنے سے انکار کیا۔ دوسرے کے پاس دریا کے آر پار جانے کے لئے کشتی تھی تو اس نے ''غیروں'' کو سوار کرنے سے انکار کیا۔ ہوتے ہوتے مقاطعہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی سرایت کر گیا اور زندگی جہنم بن گئی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آوازِ حق بلند فرمائی تو انہیں شعبِ ابی طالب کی گھاٹی میں اپنے رفقاء سمیت دھکیل کر ان سے بھی ایسا سہ سالہ مقاطعہ کیا گیا کہ شیر خوار بچے تک دودھ کی دو بوندوں کو ترس گئے۔ صحابہ کبارؓ چمڑے کے ٹکڑوں کو پانی میں بھگو بھگو کر کھانے پر مجبور ہو گئے کیونکہ بھوک کی آگ جب بھڑک اٹھتی ہے تو سور کا گوشت بھی بقدرِ ضرورت انسان پر حلال ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی یہ کہے کہ دورِ جاہلیت کے عرب چونکہ تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ نہیں تھے اس لئے بے خبر تھے کہ مقاطعوں سے انسانی اقدار کس طرح پامال ہو جاتی ہیں۔ لیکن بات قطعی طور سے یہ نہیں ہے۔ بات یہ ہوتی تو گلوب کا سب سے متمدن، سب سے تہذیب یافتہ، سب سے تعلیم یافتہ اور سب سے ترقی یافتہ ملک ''امریکہ'' عراق، افغانستان اور دوسرے ممالک سے مقاطعہ کبھی نہ کرتا۔ اس مقاطعے سے آج نیلے آسمان کے تلے بنی نوع انسان کے دن کتنے کالے اور راتیں کتنی سفید بن گئی ہیں، اس کا اندازہ کرنا اُن لوگوں کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے جو خوشی اور غم کو فقط اپنی ذات تک محدود نہیں کرتے۔ جب سطح زمین پر انسان اور انسانیت کے لئے نمائندہ کردار ادا کرنے کا دعویٰ رکھنے والے صدر الصدور تک وہی عمل دوہرائیں جو آج سے کوئی چودہ سو برس پہلے سرزمینِ عرب کے اَن پڑھ گنوار لوگوں نے دہرایا تھا تو اس کا راست مطلب یہ ہے کہ دونوں میں ذہنی اعتبار سے کوئی بھی فرق نہیں۔ ترقی کے معیار کو صرف مالی اور مادی وسائل کے پس منظر میں متعین کرنا حقیقت پسندی نہیں ہے۔ ترقی کو اُسی وقت ترقی کہا جا سکتا ہے جب انسانی سوچ کے دھارے نے اپنے لئے صحیح سمت کا انتخاب کیا ہو۔ جب یہ دھارا مخالف سمت کو جا رہا ہو تو ایک

دن اس کا انسانیت کے لئے باعثِ زوال بن جانا یقینی ہے...... مقاطعہ عرب جاہلیت کے نیم وحشی انسان نے بھی کیا، اکیسویں صدی کے نیم ترقی یافتہ دیہاتی ‘‘دیہہ پرزیڈنٹ’’ نے بھی کیا اور سارے گلوب کے چودھری نے بھی کیا۔ کیا اس کا واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان ذہنی طور سے آج بھی اسی ‘‘خطِ افلاس’’ کے نیچے کھڑا ہے جس کے نیچے وہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے تھا!؟؟

⁂

۵۱۔ صورتِ دیوار

یہ روِش بہت دیرینہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے کو اپنی حاجت کے لئے مختلف حیلے بہانوں سے استعمال کرتا ہے۔ حاجب پوری ہو چکتی ہے تو اس سے یوں منہ پھیر لیتا ہے جیسے ان کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ کچھ لوگ اس طرزِ عمل اور وطیرۂ عادات کو فنکاری اور چالاکی کہتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ نرا دوغلا پن ہے کیونکہ فنکاری اور چالاکی کا ایک مثبت پہلو بھی ہوتا ہے۔ بے شک تمام انسان اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے سلسلے میں ایک دوسرے پر مدار رکھتے ہیں اور وہ ضرورتوں کے دھاگے سے بندھے ہوئے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان دھاگوں کو دوغلے پن سے ہی جوڑا جائے۔

آپ چاہے اسے خبط کہہ لیں لیکن میرا یہ ایمان ہے کہ اللہ نے مجھے قلم ایک

امانت کے طور پر دیا ہے۔ میں قلم کو ہمیشہ اُسی انداز سے استعمال کرنے کا خواہشمند رہتا ہوں ، جو میری دانست میں ، اللہ اور رسولؐ کے منشاء کے مطابق ہو۔ میں چاہتا ہوں (بلکہ میں اس تلاش میں رہتا ہوں) کہ لوگ مجھے قلم و قرطاس کے تعلق سے حسبِ ضرورت استعمال کرلیں تا کہ میری آرزو کی تشفی ہو سکے۔ لیکن ضرورت مند لوگ جب میرا استعمال کر چکتے ہیں تو اپنی محفلوں میں ڈینگیں مارتے ہیں کہ انہوں نے کس حیرت انگیز فنکاری سے عبدالرحمٰن مخلص کو استعمال کیا...... ایک شخص اپنے قائم کردہ فلاحی ادارے کے سلسلے میں اُس کا آئین مرتب کر کے ایک تعارفی کتابچہ تیار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی ضرورت میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے ادارے کے مقصد سے آگاہ ہو کر اس کی ضرورت کئی ماہ کی محنت سے پوری کرلی۔ اپنی ضرورت کے ایام میں وہ بلا ناغہ حاضری دے کر مجھ سے قریب تر ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ ضرورت پوری ہو چکی تو اس نے آنے میں ناغہ کرنا شروع کیا۔ پھر ناغے وہی صورت اختیار کر گئے جو سورج ڈوبنے کے وقت کرتا ہے۔ پہلے ذرا سا غائب ہوا، پھر اور ذرا سا، پھر اور ذرا سا، پھر آدھا، پھر پونا اور پھر پورا اور پھر نظروں سے اوجھل.......... ایک صاحب نے جریدہ نکالنا چاہا۔ گھٹنوں کے بل چلنے والے بچے چونکہ جریدے کو نکالنے کے بعد چلا نہیں سکتے اور پھر چلانے کے بعد قائم نہیں رکھ سکتے، اس لئے وہ میرے پاس آیا۔ بہت ہی مسکین صورت بنا کر مسمی آواز میں منت سماجت کرتے ہوئے مجھ سے تعاون کی ''درخواست'' کی۔ میں نے تعاون دیا اور ایسا بھرپور دیا کہ اللہ کے فضل سے جریدہ گولڈن جوبلی منا گیا۔ گولڈن جوبلی کے ساتھ ہی ایڈیٹر صاحب کی طبیعت ''ڈائمنڈ'' ہو گئی اور مجھ پر دلبرانہ انداز میں اُردو کے بجائے غلط سلط انگریزی میں رعب جمانے لگے اور اپنے دفتر کے ہو رہے.......... ایک عزیز ایم۔اے (اردو) کرنے جا رہے تھے۔ فائنل امتحان میں پچیس دن تھے کہ میرے پاس آ کر اپنے ایک بھی کتاب نہ پڑھنے کا رونا رونے

لگے۔ میں نے اس کی ایسی مدد کی کہ بس پاس ہو گئے۔ میری جگہ کوئی سر پھرا ہوتا تو وہ اس سے کہتا کہ: ”میاں! امتحان آپ کا ہے، میرا نہیں۔ اس لئے یہ شعر ذہن میں رکھو اور چلتے پھرتے نظر آؤ“۔

ہے امتحاں سر پر کھڑا
محنت کرو، محنت کرو

پھر ایک دن اسے یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ”عبدالرحمٰن مخلصؔ میری کیا مدد کرتا، وہ تو نقل کر کے ایم۔ اے میں فرسٹ پوزیشن لے اُڑا ہے!“۔

واقعات سنانے بیٹھوں تو وہ شاید ختم ہونے کا نام ہی نہ لیں، اس لئے عرض کروں گا کہ میں بازار کی وہ دیوار بن گیا ہوں جس پر ہر کوئی اپنے سودا کا اشتہار چسپاں کرتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔ مجھے اس طرح کی دیوار بننا پسند ہے۔ آپ بھی کسی سودا کا اشتہار چسپاں کرنا چاہتے ہوں تو تحصیل سوپور، ضلع بارہمولہ کے گاؤں سیر جاگیر تشریف لائیں...... لیکن کیا کسی کو اس قسم کی دیوار بننا چاہیئے، یہ اپنی اپنی سوچ کی بات ہے۔

شہر میں صورتِ دیوار تماشا ہوں جلیلؔ
اشتہاروں کی طرح لوگ ہیں چسپاں مجھ سے

(جلیلؔ نظامی)

* * *

۵۲. یہ لٹھ باز

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سِرا ملتا نہیں

منطق یا فلسفے کی حد تک پھر بھی بحث و مباحثہ کی گنجائش نکل سکتی ہے کیونکہ اس میدان میں استدلال کی بڑی ضرورت رہتی ہے جو بحث و مباحثہ کی بنیاد ہوتا ہے۔ لیکن عام قاعدہ یہ ہے کہ لوگ ہر معاملے میں بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ بحث کی گنجائش پیدا کر کے اپنی صلاحیتوں کو دوسروں پر آشکارا کرنے اور انہیں چاروں شانے چت کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ اس قسم کے طرزِ عمل میں اکثر اوقات ناخوشگوار فضاء پیدا ہوتی ہے اور ذہن کی وادیاں صحراؤں میں بدل کر بے شمار کیکٹس

کو جنم دیتی ہیں۔ یہ بات انسانی فطرت میں شامل ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے مد مقابل سے دو قدم آگے رہے حالانکہ آگے یا پیچھے رہنا زندگی کے حقیقی مقصد کے پس منظر میں کوئی بھی اہمیت نہیں رکھتا۔

دین اسلام اکثر معاملات میں بحث و مباحثہ کی زد میں آتا رہا ہے۔ مباحث کی کثرت نے جہاں بہت ساری گرہیں کھول دیں وہیں بے شمار اُلجھنوں کو بھی معرض وجود میں لایا۔ ان الجھنوں نے عام مسلمان کے لئے زندگی کو بڑا ہی تکلیف دہ بنایا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ہلاکو خان کی خونخوار فوجیں عراق کی سرحد پر دستک دے رہی تھیں تو علماء اسلام اُس وقت مساجد میں مباحثوں کے بازار گرم کئے ہوئے تھے۔ جب وہ آندھی اور طوفان کی طرح دارالسلطنت بغداد میں در آئیں تو مباحث کے رسیا عمامہ بردار علماء کرام کو بھاگنے کا بھی موقع نہ ملا یہاں تک کہ وہ اسی تباہی و بربادی کا ایک حصہ بن کے رہ گئے جس کی نظیر تاریخ انسانی میں بہت کم ملتی ہے۔

اگر بحث و مباحثہ کبھی ناگزیر ہی بن جائے تو اس میں حدود و قیود کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ لیکن یہ عمل انتہائی دشوار ہے۔ یہاں تو ریڈیو اور ٹی وی مباحث میں شامل سیاست کار اور دانشور کہلانے والے لوگ تک اتنا آپے سے باہر ہو جاتے ہیں کہ اگر ماڈی ریٹر (Moderator) درمیان میں نہ آئے تو نہ صرف پگڑیاں اچھل جائیں گی بلکہ ازار بند بھی خطرے میں پڑ جائیں گے۔ اس قسم کا طرزِ عمل دنگل اور بحث کے درمیان خطِ فاصل اُٹھا لیتا ہے اور بحث گزاروں اور پہلوانوں میں کوئی فرق نہیں رہتا جن کا مقصد مد مقابل کو کسی بھی قیمت پر چت کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

ایک بار ایک بستی کے باشندوں کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہوئی۔ اس کے حل کے لئے حریف دھڑوں نے علماء کرام کی خدمات حاصل کرلیں۔ بحث کے

روز علماء ایک بڑے ہال میں جمع ہوئے اور حسب مرتبہ بیٹھ کر اپنے ساتھ لائی ہوئی بڑی چھوٹی کتابوں کو قرینے سے رکھنے لگے تا کہ ہر کس و نا کس کتابوں کی تعداد اور سائز کے مطابق ان کی دینی فہم سے بھی آگاہ ہو جائے۔ ابھی بحث شروع ہونے میں کچھ وقت تھا کہ ایک نحیف و نزار سے مولوی صاحب قضائے حاجت کے بہانے جوتیاں سنبھالتے ہوئے باہر آگئے۔ صحن میں ان کے ایک معتقد نے پوچھا:

''قبلہ مولوی صاحب! آپ بحث شروع ہونے سے پہلے ہی کہاں بھاگے جا رہے ہیں!؟''

تو اس نے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا: ''میاں! میں نے حزبِ مخالف کے چند علماء کرام کے ''تہہ پھیرن'' چھوٹی مگر موٹی لاٹھیاں دیکھ لیں۔ مجھے یقین ہے کہ تھوڑی دیر میں وہاں لاٹھی چلے گی۔ میں چونکہ ''لٹھ باز'' نہیں ہوں، اس لئے پسپا ہونے میں ہی عافیت سمجھ لی!!!'' ....

اسلام دعوت دین کے سلسلے میں مباحث کے لئے کچھ اصول وضع کرتا ہے جن میں حکمت اور عمدگی کو اوّلیت حاصل ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ''دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ پند و نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو''۔ النحل۔ 125)

* * *

۵۳۔ لاجواب

یہ بچپن معصوم ہوتے ہوئے بھی بڑا ہی ظالم ہوتا ہے۔ ایک بار بچھڑ جائے تو لاکھ بلانے پر بھی پلٹ کے نہیں دیکھتا۔ صفحۂ ہستی پر نوکِ شمشیر سے تاریخ لکھنے والے شہنشاہوں نے اسے پکارا لیکن یہ ضدی نہیں لوٹا۔ دنیا اور اس کے جھمیلوں سے بھاگنے والے فقیروں نے بھی اسے گلے پھاڑ پھاڑ کے آوازیں دیں لیکن اس نے ایک بھی نہ سنی۔ آخر یہ کسی کی سنے بھی تو کیوں؟! بال ہٹ کا لوہا تو ساری دنیا مانتی ہے اور پھر اس کا شعور نا پختہ ہوتا ہے۔ یہ شعور ہی ہے جو انسان کو ترغیب، تخویف اور تحریص کے دام میں گرفتار کرتا رہتا ہے۔

بچپن کی گود میں کھیلنے والے دوسری جماعت کے اُس طالب علم نے اپنی دادی اماں کو ایک کہانی سنائی۔ کہانی سناتے سناتے وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا

تھا اور دادی اماں تھی کہ اسکے بچپنے کی بلائیں لے رہی تھیں۔ بولا: ''دادی اماں! دادی اماں!! ہمارے گھر میں کئی مرغیاں ہیں۔ وہ سبھی اپنے گھر پر انڈے دیتی ہیں۔ کیا کوئی مرغی ایسی بھی ہوتی ہے جو گھر سے باہر انڈا دیتی ہے؟''۔

''ہاں کوئی مرغی ایسی بھی ہوتی ہے۔ اُس مرغی کو حرامزادی کہا جاتا ہے!''
(پٔنن کو کرنَے حرامزأدٕ آسِہ لوکہٕ ہنٛدِ ہ گھرہ ماترا وِٹھول۔)

''یہ حرامزادی کیا ہوتا ہے؟''

''چل بے ہٹ! جب بڑے ہو جاؤ گے تو خود ہی سیکھ لو گے۔ باتیں کرنا کوئی تم سے سیکھے۔ ابھی ابھی کہہ رہے تھے کہ کہانی سناؤں گا۔ سنانی ہے تو سناؤ وگرنہ گیس پر میری دال جلی جا رہی ہے''!

''اچھا سناتا ہوں، سناتا ہوں...... دیکھو دادی اماں! ہمارے سکول کی بغل میں ایک بہت بڑا کانٹے دار جھاڑ ہے۔ اس کی اکثر شاخیں نیچے بہتی ہوئی ندی کے پانی کو چھو رہی ہیں۔ وہاں گرمیوں میں بڑی ہی پیاری ٹھنڈک اور بھلا بھلا سا سایہ ہوتا ہے۔ ایک دن میں ٹوائلٹ کے لئے اُس طرف گیا تو کیا دیکھا کہ ایک چاکلیٹ رنگ کی مرغی جھاڑ تلے خاموشی سے بیٹھی ہے۔ میں نے ''شی شی'' کر کے اسے بھگانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں بھاگی۔ پھر میں نے ایک ایک کر کے کئی کنکر پھینکے، وہ اپنی جگہ پر موجود رہی۔ میں ڈر گیا۔ آپ ہی نے ایک دن کہانی سناتے ہوئے بتایا تھا کہ بھوت پریت ہر طرح کی شکل وصورت دھار سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ یہ کوئی بھوت ہے۔ لیکن میں نے جی کڑا کر کے ایک ذرا بھاری پتھر اُٹھا کر اُس پر پھینک مارا تو وہ ''کڑوں کڑوں'' کرتی ہوئی اُڑ گئی۔ اس کی جگہ ایک انڈا رہ گیا جو بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اُس انڈے کو اٹھایا اور ''سر'' (Sir) کے پاس لے گیا۔ اس نے ہنس ہنس کر میری پیٹھ تھپتھپائی اور ''ویری گڈ بوائے'' کہا۔ پھر میرے سامنے انڈا پھوڑ پھینٹ کر اس

۵۳. لاجواب

یہ بچپن معصوم ہوتے ہوئے بھی بڑا ہی ظالم ہوتا ہے۔ ایک بار بچھڑ جائے تو لاکھ بلانے پر بھی پلٹ کے نہیں دیکھتا۔ صفحۂ ہستی پر نوکِ شمشیر سے تاریخ لکھنے والے شہنشاہوں نے اسے پکارا لیکن یہ ضدی نہیں لوٹا۔ دنیا اور اس کے جھمیلوں سے بھاگنے والے فقیروں نے بھی اسے گلے پھاڑ پھاڑ کے آوازیں دیں لیکن اس نے ایک بھی نہ سنی۔ آخر یہ کسی کی سنے بھی تو کیوں؟! بال ہٹ کا لوہا تو ساری دنیا مانتی ہے اور پھر اس کا شعور ناپختہ ہوتا ہے۔ یہ شعور ہی ہے جو انسان کو ترغیب، تخویف اور تحریص کے دام میں گرفتار کرتا رہتا ہے۔

بچپن کی گود میں کھیلنے والے دوسری جماعت کے اُس طالب علم نے اپنی دادی اماں کو ایک کہانی سنائی۔ کہانی سناتے سناتے وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا

تھا اور دادی اماں تھی کہ اسکے بچپنے کی بلائیں لے رہی تھیں۔ بولا: ''دادی اماں! دادی اماں!! ہمارے گھر میں کئی مرغیاں ہیں۔ وہ سبھی اپنے گھر پر انڈے دیتی ہیں۔ کیا کوئی مرغی ایسی بھی ہوتی ہے جو گھر سے باہر انڈا دیتی ہے؟''۔

''ہاں کوئی مرغی ایسی بھی ہوتی ہے۔ اُس مرغی کو حرامزادی کہا جاتا ہے!'' (پٹٔن کو کرنۓ حرامزأدۍ آسِہ لوکہٕ ہنٛدِہ گھرہ ماتراوِٹھول۔)

''یہ حرامزادی کیا ہوتا ہے؟''

''چل بے ہٹ! جب بڑے ہو جاؤ گے تو خود ہی سیکھ لو گے۔ باتیں کرنا کوئی تم سے سیکھے۔ ابھی ابھی کہہ رہے تھے کہ کہانی سناؤں گا۔ سنانی ہے تو سناؤ وگرنہ گیس پر میری دال جلی جا رہی ہے''!

''اچھا سناتا ہوں، سناتا ہوں...... دیکھو دادی اماں! ہمارے سکول کی بغل میں ایک بہت بڑا کانٹے دار جھاڑ ہے۔ اس کی اکثر شاخیں نیچے بہتی ہوئی ندی کے پانی کو چھو رہی ہیں۔ وہاں گرمیوں میں بڑی ہی پیاری ٹھنڈک اور بھلا بھلا سا سایہ ہوتا ہے۔ ایک دن میں ٹوائلٹ کے لئے اُس طرف گیا تو کیا دیکھا کہ ایک چاکلیٹ رنگ کی مرغی جھاڑ تلے خاموشی سے بیٹھی ہے۔ میں نے ''شی شی'' کر کے اسے بھگانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں بھاگی۔ پھر میں نے ایک ایک کر کے کئی کنکر پھینکے، وہ اپنی جگہ پر موجود رہی۔ میں ڈر گیا۔ آپ ہی نے ایک دن کہانی سناتے ہوئے بتایا تھا کہ بھوت پریت ہر طرح کی شکل وصورت دھار سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ یہ کوئی بھوت ہے۔ لیکن میں نے جی کڑا کر کے ایک ذرا بھاری پتھر اُٹھا کر اُس پر پھینک مارا تو وہ ''کڑوں کڑوں'' کرتی ہوئی اُڑ گئی۔ اس کی جگہ ایک انڈا رہ گیا جو بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اُس انڈے کو اٹھایا اور ''سر'' (Sir) کے پاس لے گیا۔ اس نے ہنس ہنس کر میری پیٹھ تھپتھپائی اور ''ویری گڈ بوائے'' کہا۔ پھر میرے سامنے انڈا پھوڑ پھینٹ کر اس

۵۳. لاجواب

یہ بچپن معصوم ہوتے ہوئے بھی بڑا ہی ظالم ہوتا ہے۔ ایک بار بچھڑ جائے تو لاکھ بلانے پر بھی پلٹ کے نہیں دیکھتا۔ صفحۂ ہستی پر نوکِ شمشیر سے تاریخ لکھنے والے شہنشاہوں نے اسے پکارا لیکن یہ ضدی نہیں لوٹا۔ دنیا اور اس کے جھمیلوں سے بھاگنے والے فقیروں نے بھی اسے گلے پھاڑ پھاڑ کے آوازیں دیں لیکن اس نے ایک بھی نہ سنی۔ آخر یہ کسی کی سنے بھی تو کیوں؟! بال ہٹ کا لوہا تو ساری دنیا مانتی ہے اور پھر اس کا شعور ناپختہ ہوتا ہے۔ یہ شعور ہی ہے جو انسان کو ترغیب، تخویف اور تحریص کے دام میں گرفتار کرتا رہتا ہے۔

بچپن کی گود میں کھیلنے والے دوسری جماعت کے اُس طالب علم نے اپنی دادی اماں کو ایک کہانی سنائی۔ کہانی سناتے سناتے وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا

تھا اور دادی اماں تھی کہ اسکے بچپنے کی بلائیں لے رہی تھیں۔ بولا: ”دادی اماں! دادی اماں!! ہمارے گھر میں کئی مرغیاں ہیں۔ وہ سبھی اپنے گھر پر انڈے دیتی ہیں۔ کیا کوئی مرغی ایسی بھی ہوتی ہے جو گھر سے باہر انڈا دیتی ہے؟“۔

”ہاں کوئی مرغی ایسی بھی ہوتی ہے۔ اُس مرغی کو حرامزادی کہا جاتا ہے!“ (پٔنن کوکرنے حرامزأدکۍ آسہ لوکہٕ ہنٛدِہ گھرہ ماتر اوِٹھول۔)

”یہ حرامزادی کیا ہوتا ہے؟“

”چل بے ہٹ! جب بڑے ہو جاؤ گے تو خود ہی سیکھ لو گے۔ باتیں کرنا کوئی تم سے سیکھے۔ ابھی ابھی کہہ رہے تھے کہ کہانی سناؤں گا۔ سنانی ہے تو سناؤ وگرنہ گیس پر میری دال جلی جا رہی ہے“!

”اچھا سناتا ہوں، سناتا ہوں...... دیکھو دادی اماں! ہمارے سکول کی بغل میں ایک بہت بڑا کانٹے دار جھاڑ ہے۔ اس کی اکثر شاخیں نیچے بہتی ہوئی ندی کے پانی کو چھو رہی ہیں۔ وہاں گرمیوں میں بڑی ہی پیاری ٹھنڈک اور بھلا بھلا سا سایہ ہوتا ہے۔ ایک دن میں ٹوائلٹ کے لئے اُس طرف گیا تو کیا دیکھا کہ ایک چاکلیٹ رنگ کی مرغی جھاڑ تلے خاموشی سے بیٹھی ہے۔ میں نے ”شی شی“ کر کے اسے بھگانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں بھاگی۔ پھر میں نے ایک ایک کر کے کئی کنکر پھینکے، وہ اپنی جگہ پر موجود رہی۔ میں ڈر گیا۔ آپ ہی نے ایک دن کہانی سناتے ہوئے بتایا تھا کہ بھوت پریت ہر طرح کی شکل وصورت دھار سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ یہ کوئی بھوت ہے۔ لیکن میں نے جی کڑا کر کے ایک ذرا بھاری پتھر اُٹھا کر اُس پر پھینک مارا تو وہ ”کرؤں کرؤں“ کرتی ہوئی اُڑ گئی۔ اس کی جگہ ایک انڈا رہ گیا جو بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اُس انڈے کو اٹھایا اور ”سر“(Sir) کے پاس لے گیا۔ اس نے ہنس ہنس کر میری پیٹھ تھپتھپائی اور ”ویری گڈ بوائے“ کہا۔ پھر میرے سامنے انڈا پھوڑ پھینٹ کر اس

کا آملیٹ سٹو پر تیار کیا اور ’’لو اسے‘‘ پر رکھ کر کھالیا۔ میں سمجھا دوسرے دن ’’سر‘‘ کا دیہانت ہو چکا ہوگا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بھوت پریت نے انڈے کی شکل اختیار کرلی ہو۔ لیکن دوسرے دن جب میں نے دوسرا انڈا لا کر ’’سر‘‘ کے حوالے کیا اور اس نے اس کا بھی آملیٹ بنا کر کھالیا تو میں سمجھ گیا کہ یہ بھوت پریت والی باتیں بس کہانیاں ہیں۔ اب میں بہت دن تک انڈا لاتا رہا اور ’’سر‘‘ آملیٹ بناتا رہا اور مجھے ’’ویری گڈ بوائے‘‘ کہتا رہا۔ لیکن آج مجھے خیال آیا کہ میں انڈا ’’سر‘‘ کو دینے کے بجائے گھر کیوں نہ لاؤں اور آملیٹ بنا کر خود کھالوں۔ دادی اماں! آپ نے ہی تو کہا تھا کہ چوری کا گُڑ زیادہ میٹھا ہوتا ہے۔ یہ لو انڈا اور مجھے ایک گرما گرم آملیٹ بنا کے دے دو!‘‘ دادی اماں سٹپٹائی اور بولی: ’’ہائے اللہ! اب تم چوری بھی کرنے لگے ہو؟ جانتے نہیں کہ چوری کرنا گناہ ہے!‘‘ ’’ہاں دادی اماں! سنا تو میں نے بھی ہے، لیکن جب ’’سر‘‘ کے لئے گناہ نہیں ہے تو میرے لئے کیوں؟؟‘‘ دادی اماں نے جواب دینے کی بہت کوشش کی لیکن نہ دے سکی!!!

⁂

۵۴. راہِ اصلاح

اگر کوئی ہم سے یہ پوچھے کہ ”جناب! اس دُنیا میں آپ سب سے زیادہ کس پر اعتبار کرتے ہیں، کس پر حق اور اختیار رکھتے ہیں، تو اکثر لوگ اپنے بیوی بچوں ، یار دوستوں اور سگے سمبندھیوں کا نام لیں گے۔ یہ بڑی حد تک صحیح بات ہے بھی کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ معاملاتِ زندگی کا قریبی تعلق رہتا ہے اور ان ہی کے بارے میں آدمی ضرورت کے وقت دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ وہ ان پر حق اور اختیار رکھتا ہے۔ شاید اسی حق و اختیار کے پیش نظر ہم اصلاحِ معاشرت اور تبلیغ دین کے وقت اپنی مہم یا مشن کا آغاز ان ہی لوگوں سے کرتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہماری بات سنیں اور سن کر من وعن عمل بھی کریں کیونکہ مشہور انگریزی مثل ہے: Charity begings at home۔ یہ سب لوگ ہماری باتیں سنتے بھی

ہیں اور اُن پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ اس لئے تقریباً سبھی نالاں ہیں کہ شاید ہوائے ردّی چلی ہے اور پند و نصائح اور موعظت و مواعظ کا پیڑ ثمر آور نہیں ہوتا۔

میرے خیال میں موقع شکایات کا دفتر کھول کے بیٹھنے کا نہیں بلکہ سوچنے کا ہے کہ ہر انسان کی اپنی افتادِ طبع، طرزِ فکر، طریقِ زندگی اور مادۂ ردو قبول ہے۔ اگر ہم اپنے اعتقادات اور نظریات کو اُن پر مسلط کرنے کی کوشش کریں اور وہ ازراہِ مروّت انہیں قبول کرنے پر آمادہ بھی ہو جائیں تو انہیں "ذات" کے سنگین حصار میں محفوظ اپنی "اَنا" کے ساتھ خون ریز جنگ کرنا پڑے گی۔ اُس جنگ میں ان کی ذات کی جو شکست و ریخت ہوگی وہ یقیناً ہولناک اور حسرت ناک ہوگی۔ اسلئے کسی کو بدلنے کیلئے اس کی ذات کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور دست درازی کرنا غیر مدبّرانہ اور غیر حکیمانہ فعل ہے۔ حکیمانہ اور مدبرانہ فعل یہ ہے کہ دوسروں کو بدلنے کیلئے اپنی ذات کو بدلا جائے کیونکہ یہ بس اپنی ہی ذات ہے جس پر انسان کامل حق اور اختیار رکھتا ہے۔ انسان جس راہ پر بھی چاہے، اپنی ذات کو بلا حیل و حجت لے سکتا ہے۔ جب ایک شخص بدل جائیگا تو ایک دن بدلے ہوئے لوگوں کی تعداد قابل لحاظ (Considerable) ہو جائیگی۔ یہ حقیقت شاید ہی کوئی نہ جانتا ہو کہ ایک کلو دودھ کو جمانے کیلئے دس پانچ بوندوں سے زیادہ دہی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دنیا میں آج تک جتنے بھی مصلح گزرے ہیں، انہوں نے پہلے اپنی ذات کو بدلا ہے۔ جس مصلح نے بھی اپنے آپ کو بدلے بغیر دوسروں کو بدلنے کی کوشش کی وہ نہ صرف ناکام ہوا بلکہ ناکامی کی داستان کو رقم کر کے بہت سارا کاغذ اور روشنائی ضائع ہو جانے کا بھی ذمہ دار بنا۔ یہ ایک آفاقی حقیقت ہے یعنی Universal Truth کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ جب ایک انسان "بدلا ہوا" ہو تو کیا یہ فرض کر لینا غیر حقیقت پسندانہ نہیں کہ اس سے متصل لوگ اس کا رنگ اختیار نہیں کریں گے!؟

۵۵. کمزوری

زبردست قوتِ تسخیر کے باوجود انسان اصل میں بے حد کمزور ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کمزوریوں کا مرکب ہے تو غلط نہ ہوگا۔ لیکن کمزوری جب تک دوسروں پر منکشف نہیں ہوتی، محض کمزوری ہی رہتی ہے، ذات کے لئے مضرت رساں نہیں بنتی۔ لیکن جوں ہی ظاہر ہوتی ہے، باعثِ آزار بنتی ہے۔

وہ دو جوان خراماں خراماں آگئے اور پبلک پارک میں بیٹھ گئے۔ ایک لمبا تڑنگا مضبوط قد کاٹھی کا تھا۔ اس نے نیوی بلیو کلر کا جینز اور سفید براق آدھے بازوں والی اِنر (Inner) پہنی تھی۔ اس کا چواڑ چکلا سینہ اور بازووں کی تھرکتی مچھلیاں اس کے شہہ زور ہونے کی چغلی کھا رہی تھیں۔ وہ بار بار اپنے شکاری جوتوں کے تسمے کھولتا باندھتا تھا اور بائیں ہاتھ سے اپنی تابدوش دراز زلفوں کو

سنوارتا تھا جس سے اس کی کلائی پر بندھی ہوئی سنہری گھڑی کھلی دھوپ میں بجلیوں کا سماں پیدا کرتی تھی۔ اس کا رہ رہ کر قہقہے لگانا اُس کے سرخ وسپید چہرے کے پس منظر میں من کو بہت بھاتا تھا......

دوسرا سرمئی رنگت کا ایک ٹھگنا سا لاغر آدمی تھا جس کے چہرے کی طوطے جیسی ناک اُس کے نچلے ہونٹ پر ٹھونگیں مار رہی تھی۔ وہ پہلی ہی نظر میں نحیف ونزار لگ رہا تھا۔ اُس کے آسمانی رنگ کے کرتے پاجامے سے باہر نکلے ہوئے استخوانی ہاتھ پاؤں پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ وہ پیدائشی بیمار ہے۔ پاؤں کے میلے نیلون چپل، سر کے چھوٹے روکھے بال اور مٹیالی آنکھیں اس کی شخصیت کو اور بھی ناگوار بنا رہی تھیں۔

وہ بہت دیر تک چہک چہک کر باتیں کرتے ہوئے سگریٹ پھونکتے رہے۔ پھر ان کی آوازیں آہستہ آہستہ ناخوشگوار ہوتی چلی گئیں۔ پھر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ انہوں نے ایک دوسرے کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور کھڑے ہوکر ناشائستہ الفاظ بکنے لگے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اب ٹھگنے کی خوب پٹائی ہوگی کیونکہ جب بھی کمزور نے طاقت ور کے منہ لگنے کی کوشش کی ہے، وہ پٹتا ہی رہا ہے۔ پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ پہلوان نما جوان دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر نیچے بیٹھتا چلا گیا اور مدقوق اس کی دُھنائی کرتا رہا۔ وہ بڑی سعادت مندی سے 1947ء سے پہلے کے شاگرد کی طرح جیسے استاد کی مار کھاتا رہا۔ میں سوچنے لگا: ”اے تُف ہے!! اگر تم جارحیت کے اہل نہیں ہو لیکن کم سے کم اپنا دفاع تو کرو۔ اس کسرتی جسم کو کیا تم جہنم کے لئے سنبھال کے رکھ رہے ہو!؟ جب بھی کمزور نے سر جھکایا ہے، طاقت ور اور بھی شیر ہوتا رہا ہے۔ ارے او بندۂ خدا!! اخلاقی طور سے بھی صرف جارحیت جرم ہے۔ رہا اپنا دفاع، تو وہ اِس صفحۂ ہستی پر سانس لینے والے کسی بھی زندہ مخلوق کا حق ہے“۔ لیکن میری سوچ کے دھاگے اُس وقت ٹوٹ

گئے جب اس نے بھاگ کر پارک کا جنگلہ پھاندا اور بھیڑ میں گم ہو گیا۔

میں حیرتوں کے سمندر کو پار کرتا ہوا مدقوق جوان کے پاس گیا جو اپنے کولھوں پر دونوں ہاتھ دھرے رُستم زماں بنا ہوا اُس سمت کو خشم آلود نگاہوں سے گھور رہا تھا جدھر اُس کا حریف بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا:

''معاف کرنا جناب! کیا آپ کے پاس کوئی جنتر منتر ہے جو آپ نے اس دیو ہیکل حریف کو اس طرح پچھاڑ دیا!؟''

''اجی جناب! جنتر منتر خاک بھی نہیں۔ میں اس کی ایک کمزوری کا فائدہ اٹھاتا ہوں!'' وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

''کمزوری؟ کیسی کمزوری!؟''

''وہ دراصل گنجا ہے اور سر پر ''وِگ'' (Whig) لگائے رہتا ہے۔ جب کبھی ہمارا جھگڑا ہو جاتا ہے تو میں اس کے سر کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں اور وہ افشائے راز کے خوف سے بھیگی بلّی بن جاتا ہے۔ ورنہ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ!!'' وہ زور سے ہنس پڑا اور میں اُس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوا حالانکہ دوسروں پر ہنسنا میری عادت نہیں !!!!

❑⌘❑

۵۶. میلی چادر

وہ غضب کا خوبصورت اور خوش پوش آدمی تھا۔ چھریرے بدن پر اس کا تھری پیس سوٹ، دمکتے ڈارک براؤن جوتوں اور چمکتے کالے بالوں کے ساتھ دیکھنے والوں کو مسحور کرتا تھا۔ سرخ وسپید رنگ، ستواں ناک، گہری کالی آنکھیں، فراخ ماتھا اور سلیقے سے تراشیدہ ہلکی مونچھیں اس کے مردانہ حسن کو اور بھی قیامت خیز بناتی تھیں۔ چونکہ ہر روز شیو کرنے کا عادی تھا، اس لئے چہرے پر ہمیشہ ایک چکنائی سی دِکھتی تھی جیسے کسی نے گولڈن براؤن ٹیک وُڈ پر ہلکا وارنش پھیر دیا ہو۔

کہتے ہیں جب خدا کسی کو حسن دیتا ہے تو نزاکت خود بخود آجاتی ہے۔ جب مشرق کی طرف کھلنے والی اس کے بیڈروم کی دیوار تا دیوار شیشے کی کھڑکی سے آنے والی نرم دھوپ اُس سے بہت دیر تک اٹکھیلیاں کرتی رہتی تو وہ کسمساتا ہوا بیدار ہو جاتا۔

ایک لمبی انگڑائی اور چوڑی جماہی لے کر بیڈٹی کا ایک کپ کسلمندی کے انداز میں نوش کر کے باتھ روم کا رُخ کرتا۔ باتھ روم کا دروازہ کھلتے ہی ایوننگ اِن پیرس کی خوشبو کا ایک جھونکا اس کا استقبال کرتا۔ پھر شیو کرنے سے باتھ ٹب اور شاور سے لطف اندوز ہونے تک دیوار گیر کلاک ہزاروں بار سینہ کوبی کرتا لیکن اس کا عیش قطعی طور پر تُرش رُو نہیں ہوتا تھا۔ پھر کپڑے پہننے اور بریک فاسٹ کا عمل بڑا ہی ہیجان انگیز ہوتا تھا۔ اس کا اپنے بدن پر سجے ہوئے سوٹ، ٹائی اور بالوں کو ہر زاویے سے پرکھنے کا عمل اگرچہ اوروں کے لئے بڑا تکلیف دہ ہوتا، لیکن اس کا پسندیدہ شغل تھا۔ پھر وہ شاعر کے تخیل کی طرح رنگین موٹر کار میں ہزاروں اداؤں کے ساتھ سٹیرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھتا تو لازمی طور پر آئینۂ عقب نما میں ایک بار پھر اپنا جائزہ لیتا حالانکہ یہ بات تحصیل حاصل کے مترادف ہوتی۔ پھر وہ اپنی گاڑی کو چمکیلی سڑک پر یوں دوڑاتا جیسے کوئی طلائی مچھلی نقرئی جھیل میں رواں ہو۔

وہ چونکہ اپنے اصول خود وضع کرنے کا عادی تھا، اس لئے اس کے دفتر کی ہر چیز اس کی مرضی کی غلام تھی۔ آفیسرز چیئر اور ٹیبل سے لے کر دیواروں کے رنگ روغن، فرش کی سجاوٹ، کرسیوں صوفیوں کی ترتیب، پردوں کی بوقلمونی اس کے ذوقِ جمال اور احساسِ لطیف پر خاموشی سے دلالت کرتی تھی۔ وہ بار بار زور دے کر کہتا رہتا تھا کہ ہر چیز اپنی جگہ مناسب زاویے کے ساتھ رہنی چاہئے۔ اگر میز رکھی ہے، ٹی پائے رکھا ہے تو ان کو ہر حال میں دیواروں کے متوازی ہونا چاہئے۔ یہ تو اُجڈپن ہے کہ چیز تو زاویہ قائمہ پر رہنے کی متقاضی ہو اور چپراسی اُسے زاویہ حادہ یا منفرجہ پر رکھے۔ کبھی ایسا ہوجاتا تو آفیس چیمبر میں زلزلہ آتا اور بے چارہ چپراسی بید مجنوں کی طرح لرزتا رہتا۔ اس طرح اُس کا ایک اپنا سٹائل بن گیا تھا جس میں اس کے افسرانِ بالا بھی دخل انداز ہونے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر بات میں ''چیزے دیگر'' یعنی Somthing Different کہلانے کا قائل

تھا۔ اس لئے سگریٹ کے بجائے سگار پیتا تھا تاکہ عام افسروں میں شمار نہ ہو۔

اس سارے کروفر اور جاہ وجلال کے عین درمیان اس کا ایک اور اصول بھی تھا کہ وہ کوئی کام بھاری رشوت کے بغیر نہیں کرتا تھا۔ اس معاملے میں وہ اپنے پرائے، غریب امیر کا قطعی لحاظ نہیں کرتا تھا۔ وہ اس لین دین میں اتنا ایماندار تھا کہ اسامی کے ساتھ باضابطہ طور سے خود مول بھاؤ کرتا تھا۔ ایک بھی روپے کا فرق رہ جاتا تو وہ ٹکا سا جواب دے کے سامنے والے کو باہر کا راستہ دکھاتا تھا۔ رشوت ستانی چونکہ ہر مذہب میں مذموم ہے، اس لئے اسکے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی طرح کے دوست اسے بھگوان، خدا، واہگرو اور گاڈ کا ہوّا دکھا کر ڈرانے کی کوشش کرتے، لیکن چونکہ اس نے نہ ڈرنے کی قسم کھا رکھی تھی اس لئے وہ تخویف وترغیب اور پند ونصائح کو اپنے چُرٹ کے دھوئیں میں اُڑاتا۔ لوگ اس کے خلاف حکام بالا سے شکایتیں بھی کرتے رہتے تھے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا کیونکہ وہ مال کو بانٹ کر کھانے کا قائل تھا۔ اس لئے جب سیّاں بھئے کوتوال ہوں تو ڈر کاہے کا!

ایک روز وہ اپنی سنہری مچھلی کو نقرئی سڑک پر فراٹے سے دوڑا رہا تھا کہ سامنے سے آنے والی تیز رفتار ٹرک سے ٹکرا گیا جسے ایک سردار جی چلا رہے تھے۔ بِگ بینگ (Big Bang) ہوا اور ایک نئی کائنات وجود میں آ گئی۔ اس کا مہکتا ہوا خوبصورت جسم سڑک کے بائیں جانب بدبودار کھائی میں خون اُگلنے لگا۔ خدا ترس ٹرک ڈرائیور نے بھاگ جانے کے بجائے اپنے کاندھے پر رکھی ہوئی کالی دھاریوں والی میلی چادر اُس پر پھیلا دی، جس سے ڈیزل، گریز اور موبل آئل کی بدبو اُٹھ رہی تھی!

* * *

۵۷. روشن ہالہ

اسلام میں کسی کے بھی متعلق حسنِ ظن قائم کرنے کی بڑی تاکید پائی جاتی ہے لیکن جہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو وہاں حسنِ ظن قائم کرنا ایک امر دشوار بن جاتا ہے۔ اس کے باوجود حسن ظن کی اہمیت اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ بصورت دیگر معاشرتی امور کا شیرازہ عدم اعتماد کی فراوانی کی وجہ سے منتشر ہو کے رہ جائے گا اور انسان نفسیاتی مریض کہلائے گا جس کے تصورات کی عمارت بالعموم اوہام کی بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہے۔

وہ موسمِ برسات کی ایک خوبصورت صبح تھی۔ سپیدۂ سحر ابھی نمودار ہی ہوا تھا کہ میں اپنے گاؤں سے شہر سرینگر جانے کے لئے پاپیادہ گھر سے روانہ ہوا۔ پچیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد نیشنل ہائی وے پر پہنچ گیا اور کسی تیز رفتار

سواری کا برلب سڑک انتظار کرنے لگا تا کہ سرینگر پہنچ کر امتحان میں بروقت شرکت کر سکوں۔ جب ایک ٹرک سرینگر کی طرف رواں دواں نظر آیا تو میری آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہوا۔ ہاتھ اٹھا کر ٹرک کو رُکنے کا اشارہ کیا اور وہ خلافِ توقع اپنے بریکوں سے آواز پیدا کرتا ہوا رُک گیا۔ میں سوار ہوا اور ٹرک چل دیا۔

ذرا دیر بعد میں نے اپنی دائیں جانب بیٹھے ٹرک ڈرائیور سردار جی کو غور سے دیکھا۔ وہ ایک چھیل چھبیلا، بانکا البیلا سا جوان تھا۔ کس کے باندھی ہوئی پیلی پگڑی کے نیچے اس کی سرمگیں آنکھیں اوپری ہونٹ پر تقریباً زاویہ قائمہ بناتی ہوئی سرخی مائل ہلکی مونچھیں، پتلے گلابی ہونٹ اور چمکتے سفید دانت اُس کے مردانہ حسن میں چار چاند لگا رہے تھے۔ اس نے بایاں ہاتھ آگے بڑھا کر ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبایا اور پنجابی موسیقی کی مستانی گونج نے فرنٹ سیٹ کے سارے ماحول کو شرابور کیا۔ موسیقی ویسے بھی سحر طراز ہوتی ہے لیکن پنجابی موسیقی میں نغمگی اس قدر رچی بسی ہوتی ہے کہ ہاتھ پاؤں وجد میں آہی جاتے ہیں اور انسان نہ چاہتے ہوئے بھی تال دینے لگتا ہے۔ سردار جی اپنی انگلیوں سے سٹرینگ وہیل پر اور پاؤں سے بریک شوز پر تال دینے لگے اور میں کھو گیا۔

یکایک میں نے محسوس کیا کہ ٹرک ڈول رہا ہے اور جھوم رہا ہے۔ کبھی یک لخت دائیں کو جاتا اور کبھی بائیں کو۔ کبھی سڑک کے درمیان تھوڑی دُور تک مناسب چال سے چلتا ہے۔ پندرہ بیس منٹ تک تو میں دل پر جبر کر کے اپنے آپ کو کوئی رائے قائم کرنے سے باز رکھتا رہا لیکن جب ٹرک کی چال بدستور شرابی رہی تو میں نے پکّی رائے قائم کر لی کہ سردار جی نے کم سے کم ایک بوتل چڑھا رکھی ہے کیونکہ ڈرائیور لوگ عام طور پر رند بلانوش ہوتے ہیں۔ جب موسم برسات کا ہو، کالی کالی گھٹائیں گھِر گھِر کے آرہی ہوں اور رِم جھم پانی برس رہا ہو تو ایک عام آدمی بھی فیض کی زبان سے کہہ سکتا ہے۔

آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

ویسے مجھے شراب، موسم اور سردار جی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ لیکن ان تینوں کے ڈانڈے میری زندگی اور موت سے ملنے لگے تو میں گھبرا اُٹھا۔ میں نے بڑے ہی محتاط انداز میں اپنی دائیں جانب سرکنا شروع کیا۔ جب میری ناک اور سردار جی کے منہ میں بالشت بھر کا فاصلہ رہا تو میں نے ایک لمبا سانس دھیرے سے کھینچا۔ دماغ میں شراب کی بدبو کے بجائے ٹوتھ پیسٹ کی خوشبو سما گئی۔ میں حیران ہوا کہ اگر سردار جی نے پی نہیں لی ہے تو ٹرک کی چال مستانی کیوں ہے!؟ سردار جی اس کیفیت کو بھانپ گئے اور ایک جاندار قہقہہ لگا کے بولے: ''اے اوپراوا کس پھیر میں پڑ گئے تم بھی!؟ بھلا صبح کا وقت پینے کے لئے ہوتا ہے؟! یہ وقت تو واہگرو کو یاد کرنے کا ہوتا ہے۔ پی تو شام کو جاتی ہے جب دن کا اُجالا بندے کے کس بل نکال چکا ہوتا ہے!!''

''پھر تم یہ گاڑی جھوم جھوم کے اور گھما گھما کے کیوں چلا رہے ہو؟''

''اے وہ دیکھتے نہیں ونڈ سکرین سے آگے سڑک پر ہزاروں لاکھوں برساتی مینڈکوں کی اُچھل کود! گاڑی کو گھما پھرا کے انہیں زد میں آنے سے بچا رہا ہوں۔ اب میں رب تو نہیں کہ انہیں بچا ہی لوں لیکن بچانے کی کوشش تو کر سکتا ہوں!!''

یہ سن کر میں نے محسوس کیا کہ اس کی پیلی پگڑی کے گرد ایک سفید سا روشن ہالہ بن گیا جو میں نے گرونانک دیو جی کی تصویر پر دیکھا ہے!۔

⌘

۵۸. مرکز کی سازش

ایک مقامی اخبار کی حالیہ اشاعت کے "باٹم" کی جلی سرخی اس طرح سے ہے: "کشمیر میں حوّا کی بیٹی قدم قدم پر عدمِ تحفظ کا شکار بنتی جا رہی ہے"۔ اس کے ذیل میں یہ جملہ بھی ہے: "..........تاہم اس طرح کا تصور زور پکڑتا جا رہا ہے کہ کشمیر کو جان بوجھ کر جرائم کی منڈی میں تقسیم (تبدیل) کیا جا رہا ہے"۔ یہ بات آفتاب سے زیادہ روشن ہے کہ آج کل بے پردگی، بے راہ روی، بے حیائی، بے شرمی، بے غیرتی اس قدر عام ہوگئی ہے کہ بس زندگی کا جُز بن گئی ہے اور جو چیز جزوِ زندگی بن جائے، اُسے زندگی سے الگ کرنا یا الگ کرنے کی کوشش کرنا ایک غیر حقیقت پسندانہ فعل لگتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ان برائیوں کو کسی تمغے کی طرح قبول کر کے اپنے کلچر کے سینے پر نہیں سجا سکتے کیونکہ مشرق عموماً اور اسلام

خصوصاً جس تہذیب وتمدن کا علمبردار اور روادار ہے، اس میں ان فواحش کو کھپانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم کسی بھی الزام کو، چاہے وہ صدفی صد درست کیوں نہ ہو، فراخدلی سے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے بلکہ الٹ پھیر کے بعد اُس کا رخ دوسروں کی طرف پھیرنے اور خود صاف بچ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ یہ کوشش عبث ہے، جب تک نہ ہماری معصومیت اور پاکدامنی کے حق میں ٹھوس دلائل وبراہین سامنے آئیں۔ بدقسمتی سے میری نظر میں آج تک ایک بھی ایسی دلیل نہ آسکی جو ہمیں حتمی طور سے معصوم ثابت کرسکے۔

اگر آپ میری عمر کے ہیں تو آپ کو یاد ہوگا اور مجھ سے کم عمر ہیں تو تقریباً سنا یا پڑھا ہوگا کہ سیاسی عدم استحکام اور خلفشار کے نتیجے میں ہماری ریاست 1947ء سے ہی رنگارنگ حادثات کی آماجگاہ رہی ہے۔ لیکن جب بھی کوئی حادثہ وقوع پذیر ہوا تو ہم نے بلاسوچے سمجھے یک زبان ہو کے کہا: ''یہ مرکز (دہلی) کی سازش ہے'' بلاشک وشبہ ''مرکز'' یہاں کبھی بھی نیک نیت نہیں رہا۔ (رہا ہوتا تو اس سرزمین سے خون کے چشمے کبھی نہ پھوٹتے۔) لیکن اتنا دخیل بھی کبھی نہیں رہا کہ بھائیوں کی تقسیم جائیداد، ہمسائیگی کے معاملات یا میاں بیوی کے تنازعات میں فریق بن جائے۔ اگر ہماری بیٹی، بہن، بہو نیچے گریباں کا سلیولیس (Sleeveless) اِنر اور جینز پہن رہی ہے تو اس میں مرکز کی سازش کہاں سے آگئی۔ بے شک مرکز کی تحویل میں الیکٹرانک میڈیا جیسا زبردست ذریعہ ابلاغ ہے جس پر کبھی کبھی بے ہودگی کا مظاہرہ ہوتا ہے لیکن ہمارے پاس بھی قرآن مجید موجود ہے جو ابلاغ کا قوی ترین سرچشمہ ہے۔ اب اگر ہم دُوردَرشن، پی۔ ٹی۔ وی، انڈس ویژن، ذی، سہارا اور کیبل نیٹ ورک کی تمام دوسری چینلوں سے تو واقف ہیں لیکن قرآن مجید سے ناواقف ہیں تو اس میں ''بے چارے'' مرکز کا کیا قصور؟ قصور اگر کسی کا ہے تو وہ ہم

ہیں۔ ہمیں پوری دیانت داری سے قبول کرنا چاہیئے کہ ہمارے تہذیبی حصار میں کسی نازک جگہ کوئی سوراخ ضرور ہے جہاں سے گندگی اور غلاظت رِس رِس کر اندر آرہی ہے۔ ہمیں گندگی کے منبع کو تلاش کرنے اور واویلا کرنے کے بجائے اس رخنے کو تلاش کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہم اس دور میں جی رہے ہیں جس میں ہر طرف گندگی ہی گندگی ہے۔ گندگی اور اس کے پھیلانے والوں کے خلاف محاذ بنانے کے بجائے ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنی تہذیبی اور ثقافتی دیوار کو اتنا مضبوط اور بلند کیا جائے کہ یہ اندر داخل ہی نہ ہو سکے۔ یہ تذکرہ یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ساٹھ کی دہائی کے آس پاس جب یہاں مرکز کی سازشوں کا بہت چرچا تھا تو ایک میاں کی بیوی اپنے میکے کی طرف بھاگی۔ بے چارے میاں دُنبال میں اپنی سسرال پہنچے اور ساس سسر کی موجودگی میں اپنی بیوی سے تقریباً روتے ہوئے سوال کیا ”للہ مجھے بتاؤ کہ تم گھر سے بھاگی کیوں!؟“ ایک شریر نے کھڑکی سے اندر جھانکتے ہوئے اونچی آواز میں کہا: ”یہ مرکز کی سازش ہے!!“۔

◆

۵۹. آل حاجی

زمانہ تو ہوا ہے جسے کوئی بھی باندھ کے نہیں رکھ سکتا۔ یہ آج گرم ہے تو کل سرد، ابھی نم ہے ابھی خشک، کبھی مسموم ہے کبھی صبا، کبھی صرصر ہے کبھی سبک۔ زمانے کے بطن سے جنم لینے والے واقعات وحادثات بھی اپنی ماں پر ہی جاتے ہیں اور فطرت میں اسی کے مماثل ہوتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ لوگ پہناوے کی چیزیں خریدتے وقت شرح فی صد کا خاص خیال رکھتے تھے۔ قمیص پاجامے کیلئے کپڑا خریدتے تو ایٹی ٹونٹی (80:20) کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ جب ٹیرین اسّی فیصد اور کاٹن بیس فیصد ہو تو کپڑے میں پائیداری بھی ہوتی تھی اور خوبصورتی بھی۔ جیسے ''اینگلوانڈین''۔ کچھ زیادہ وقت نہ گذرا کہ لوگ سڑسٹھ تینتیس (67:33) کے دیوانے ہوگئے۔ یہ ٹیرین ہے

تو مضبوط لیکن ہے ذرا زہریلا۔ تن کو چھوتے ہی چنگاریاں جھاڑنے لگتا ہے۔ جب پہناوے سے آگ جھڑنے لگے تو وہ جسم کو جھلسا کے نہ رکھ دے گا!؟ کچھ مدت کے بعد ایک اور لہر چلی کہ ''جناب! مہنگائی کا زمانہ ہے۔ یہ ایٹی ٹونٹی، سٹرسٹھ تینتیس بکواس ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ کپڑے آل ٹیرین، آل پولسٹر ہوں کہ انسان تو فنا ہو جائے لیکن کپڑا باقی رہے!؟'' جب لوگ واقعی فنا ہونے لگے تو ''آل کاٹن'' کی تلاش کی جانے لگی جو فی الوقت تلاشِ بسیار کے بعد ہی دستیاب ہوتا ہے کیونکہ ہر طرف سینتھیٹک فائبر (Synthetic Fiber) کا دور دورہ ہے۔ لیکن سب لہروں سے وہ لہر بڑی مستانی تھی سب لوگ گرم کپڑوں ''ٹیری وُول'' کی جگہ ''آل وُول'' کی خاصیت ڈھونڈنے لگے۔ ''بھئی وہ ''پھرن'' کوٹ بھی کوئی گرمی دے سکتا ہے جس میں اون کے ساتھ کیشمیلان یا سیٹیپل وغیرہ کی ملاوٹ ہو۔ بھئی اون تو اُون ہے۔ حضرت شیخ نوالدین ولیؒ نے یوں ہی نہیں فرمایا ہے کہ اون ہی پہننے کو، اُون ہی کھانے کو اور اُون ہی پینے کو ہو تو کیا کہنے!!''۔

اوڑھنے بچھونے یا پہناوے کی حد تک ''آل'' میں کوئی زیادہ نقصان اور نقص نہیں تھا۔ لیکن جب ''آل'' ارکانِ اسلام میں بھی دخل اندازی کرنے لگا تو مجھے بہت کھٹکنے لگا...... ایک صاحب اپنی اہلیہ محترمہ سمیت حج کر کے لوٹے تو حاجی کہلاتے پھول کر کپّا ہو گئے۔ انہیں ''حاجی صاحب'' سننے میں ایسا آنند آنے لگا کہ دوسرے سال اپنے فرزند اکبر کو معہ اہل و عیال سفر محمود کے لئے روانہ کیا۔ وہ خیر سے لوٹے تو ایک سال کے وقفے سے فرزند اصغر کو معہ بیگم صاحبہ روانہ کیا۔ اُن کی واپسی کے بعد گھر میں صرف ایک ''غیر حاجی'' رہ گیا...... گھر کا دیرینہ ملازم عمہ کاک...... نہ جانے کیا سوچ کر بڑے حاجی صاحب نے حاتمؔ کی قبر پر ایک زوردار لات رسید کی اور اسے بھی فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے بھیج دیا۔ جب سارا گھر ''آل حاجی'' بن گیا تو حاسد جلنے لگے اور حاجی صاحبان مل کر بغلیں بجانے

لگے۔ بس ایک دِقت پیدا ہوگئی کہ باہر سے کوئی ''حاجی صاحب'' پکارتا تو بیک وقت درجن بھر لوگوں کے کان کھڑے ہوجاتے اور وہ ہونقوں کی طرح ایک دوسرے سے دل ہی دل میں سوال کرنے لگتے ''اماں! کون سا حاجی مطلوب ہے؟'' بڑا، منجھلا، چھوٹا......یا......''۔

یہ سب پڑھ کر شاید آپ محسوس کررہے ہوں کہ میں اُن حاجی صاحبان کی ترقی خوشحالی سے جلن محسوس کرتا ہوں اور اُتھلے پن کی وجہ سے دوسروں کا دُکھڑا سنانے بیٹھا ہوں۔ جناب! یہ بات بالکل نہیں۔ یہ تو اوپر والے کی دین ہے۔ جسے دے تو چھپڑ پھاڑ کے دے۔ جسے نہ دے تو کوئی بھی مخلوق نہ دے، نہ دلا سکے۔ جناب عالی! یہ سب عرض کرنے میں غرض یہ ہے کہ حاجی صاحبان موصوف نے ساری کی ساری دولت ٹمبر سمگلنگ، چرس سمگلنگ اور رقبہ کا ہچرائی پرناجائز تجاوزات سے حاصل کرلی ہے۔ انہوں نے خون پسینے کی کمائی سے اپنے گھربار کو ''آل حاجی'' بنایا ہوتا تو کیا مجھے کُتے نے کاٹ کھایا تھا کہ شکایات کا دفتر کھول کے آپ کا اور اپنا وقت غارت کرتا۔ چلیئے اب آپ کا کچھ وقت لے ہی لیا تو یہ کہنے میں بھی ہرج نہیں کہ ''اللہ پاک ہے اور اپنے لئے صرف پاک ہی مال کو پسند فرماتا ہے۔ ناپاک مال پلٹ کے مالدار کے ماتھے کا داغ بن کے رہ جاتا ہے''۔

◆

۶۰. سخت مشکل

اب آپ سے کیا چھپانا کہ کثرتِ تحریر سے میری انگشتِ شہادت کی جلد اکثر پھٹ جاتی ہے جو کبھی کبھی تکلیف دہ بھی بن جاتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ کون سی غیر معمولی بات ہے۔ یہاں تو آئے دن لوگوں کی کھالیں ہی کھنچتی رہتی ہیں! لیکن جناب میرا مسئلہ یہ نہیں کہ میری انگلی کی جلد پھٹ جاتی ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ میں اس پر مرہم کے طور پر بنڈیایڈ یا بنڈیج نہیں لگا سکتا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ سوال کریں کہ "جناب! ان دنوں ہمارے دیس میں مضروب کو فقط آہ کرنے کی اجازت نہیں ہے، جسم پر بینڈ ایڈ وغیرہ چپکانے کی تو کھلی چھوٹ ہے، پھر آپ یہ کہاں کا دُکھڑا لے کے بیٹھ گئے!" اس لئے اس سے پہلے کہ آپ اندیشہ ہائے دُور دَراز میں مبتلا ہو کر میرے متعلق کوئی منفی رائے قائم کریں، یہ تفصیل پڑھ لیجئے:

ایک دن میں انگلی پر ڈریسنگ کر کے گھر سے باہر آیا۔ پہلے ہی قدم پر ایک

دوست ملے۔ میں نے علیک سلیک کے سلسلے میں مصافحے کیلئے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ چیخ کر بولے: ''ارے بھئی یہ کیا؟ یہ انگلی پر بنڈیج کیوں چڑھا رکھا ہے؟''

''بھئی جِلد ذرا پھٹ گئی ہے اس لئے مرہم لگا دیا!''

''جِلد پھٹ گئی ہے؟ ارے بھئی کمال ہے۔ کس طرح پھٹ گئی ہے!؟''

''مجھے ذرا زیادہ لکھنے کی لت پڑی ہے، اس وجہ سے!''

'اوہ پکڑے گئے نا، تم تو کہتے تھے میں ریٹائرمنٹ کے بعد اب آرام کر رہا ہوں، بھئی تم یوں ہی زیادہ نہیں لکھو گے۔ بے شک اخباروں رسالوں اور کتابوں سے خوب دھن مل رہا ہوگا!''۔

اب میں اسے کیسے باور کراتا کہ یہ پرنٹ میڈیا والے بڑے ہی خود غرض ہوتے ہیں۔ کسی کی غزل یا مضمون چھاپتے ہیں تو جیسے اُس پر اتمامِ احسان کرتے ہیں۔ خود پارٹیوں، کلبوں، کافی ہاؤس، ہوٹلوں، ریستورانوں، سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیوٹ تقریبوں میں دادِ عیش دیتے ہیں لیکن جب ادیبوں، شاعروں کو سوروپلّی بطورِ معاوضہ دینے کی بات آتی ہے تو انہیں ہچکیاں آنے لگتی ہیں۔ دوسرے صاحب ملے تو ''ہے بہتر سلام ابتدائے کلام'' کے مقولے کو بالائے طاق رکھ کر حیرت واستعجاب سے بولے: ''اے یارِ یاراں! یہ کیا ہو گیا''۔

''یار ذرا انگلی کی جلد پھٹ گئی ہے۔ اس لئے تھوڑی سی دوائی لگائی ہے''۔

''کیا کہا اُنگلی کی جلد پھٹ گئی ہے!؟'' ارے یار کمال ہے! بھلا انگلی کی بھی جِلد پھٹ جاتی ہے؟''۔ اب مجھے ہی دیکھو، تمہاری اور میری عمر میں بس اُنیس بیس کا فرق ہے لیکن میری کھال اتنی سخت ہے کہ میڈیکل اسسٹنٹ کو پہلے میرے بازو میں سٹین لیس سٹیل کیل سے سوراخ کرنا پڑتا ہے اور اس میں سے سرنج کی سوئی گزارنا پڑتی ہے۔ جِلد پھٹنے کی بات قطعی نہیں ہوگی۔ ضرور تم نے کسی کے ساتھ جھگڑا کیا ہوگا۔ وہ تمہارے داہنے ہاتھ کا ہمسایہ ہے نا، اُس کے دانت بڑے تیز

ہیں! یار تم بھی بڑے گاؤدی ہو، زیادہ شریف بن کر اوروں کو شیر ہونے کا موقع دیتے ہو۔ یار میرے! اس دور میں جینا ہے تو اپنے پنجوں کو نوکدار اور دانتوں کو کٹیلا بنا دو۔ جس کے پنجوں اور دانتوں میں آج کاٹ لینے کی طاقت نہیں، وہ بستیوں میں رہ ہی نہیں سکتا۔ اُسے تو ہجرت کر کے کسی جنگل میں بسیرا کرنا چاہئے جہاں کے جانور نسبتاً کم ضرر رساں ہیں!'' اب میں اس سے کیا بحث کرتا کہ اللہ اپنی ہر مخلوق کو ایک خاص فطرت کے ساتھ پیدا کرتا ہے۔ جو مفید ہے وہ مضر بننے کی کوشش کرے بھی تو نہیں بن سکتا۔ سانپ دودھ پلانے کے بعد بھی ڈس لیتا ہے اور مچھلی زندہ کٹ جانے باوجود منہ نہیں مارتی!

''جھوٹ، سو فیصدی جھوٹ، میاں کہیں ''وہ'' بات تو نہیں؟ نہیں سمجھے؟ ارے کسی غارت گر ہوش و خرد نے احتجاجاً اپنے لمبے ناخنوں سے کھرونچ تو نہیں ڈال دی؟؟'' یہ سن کر مجھے محسوس ہوا کہ میرا سینہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ اب میں اس قسم کے دریدہ دہن کو کیسے قائل کرتا کہ انسان کی عمر کا نصف آخر تو توبہ استغفار کے لئے ہونا چاہئے، زنانِ بازاری کا تعاقب کرنے کے لئے نہیں!!...... میں نے آہستہ سے بنڈیج کھرچ ڈالا اور آگے بڑھا۔ آخر انسان کس کس کا منہ بند کرتا پھرے۔ سو برتنوں کے دہانوں کو تو سو ڈھکنوں سے ڈھکا جاسکتا ہے لیکن سو انسانوں کے دہانوں کو ڈھکنا تو امرِ محال ہے

سخت مشکل ہے لوگوں سے چھُپا کر رونا
جب بھی رونا ہو چراغوں کو بجھا کر رونا

لوگوں کی نگاہوں کو پڑھ لینے کی عادت ہے
حالات کی تحریریں چہرے سے بچا رکھنا

* * *

٦١. سرنوشت

”جناب! حجام اور ڈی۔ ایس۔ پی (ڈپٹی سپرانٹنڈنٹ آف پولیس) میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ میرے منہ میں خاک، کجا نایدیار، کجا پروردگار والی مثال مان لیجے۔ (کہاں معمولی نائی، کہاں پروردگارِ عالم) میری مسکین صورت، استخوانی ہاتھ پاؤں اور ملگجے کپڑے میری اصلیت پر دلالت کرتے ہیں اور اس کی تاؤ دی ہوئی موچھیں، لمبے چوڑے گل مچھے، چڑھی ہوئی گھنی بھنویں، سرخ و سپید چہرہ، کسی ہوئی کھال اور مضبوط قد کاٹھی اس کی جلالتِ قدر کا اعلان کرتی ہے۔ اسلئے جب ایک دن اس نے مجھے اپنے گھر پر شیو کرنے کے لئے کہلوایا تو میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور اوسان خطا ہو گئے۔ ایک لمحے کیلئے خیال آیا کہ انکار کروں لیکن اچانک نظروں کے سامنے موٹی موٹی آہنی سلاخوں والا حوالات کا کمرہ

بھاری جوتا اور کھال میں اتر جانے والا ''کین'' لہرایا۔ میں نے اپنی پیٹھ اور پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس کی۔ ناچار میں نے اپنا بستہ اٹھالیا اور اس کے گھر کی راہ لی۔

میری چھوٹی سی دکان کے ٹوٹے پھوٹے ٹیپ ریکارڈر پر دن بھر فلمی گانے بجتے رہتے ہیں۔ ایک گیت مجھے بہت پسند ہے۔ یعنی

تیرا خط لے کے صنم۔ پاؤں کہیں رکھتے ہیں ہم
کہیں پڑتے ہیں قدم

لیکن اس بار ڈی۔ ایس۔ پی صاحب کے گھر کی راہ پر محبوب کا خط لئے بغیر ہی میں پاؤں کہیں رکھتا تھا اور قدم کہیں اور پڑتے تھے۔ جب میں ان شرابی قدموں کی مدد سے ان کی بیٹھک میں داخل ہوا تو پہلے مجھے کچھ دکھائی ہی نہیں دیا۔

اچانک جب ایک بھاری آواز میرے کانوں میں پڑی، تو جیسے کسی نے مجھ پر ٹھنڈے پانی کی پوری بالٹی اُلٹ دی۔ میں ہڑبڑا کر ہوش میں آ گیا۔ ڈی۔ ایس۔ پی صاحب کہہ رہے تھے: ''ارے بھئی آؤ استاد جی، آؤ۔ بہت انتظار کرایا''۔ میں ان کے سامنے بیٹھ گیا اور انہوں نے گاؤ تکیئے سے لگے لگے میرے سامنے سر جھکا دیا۔ میں اپنے آپ کو ظل الٰہی سمجھنے والا تھا کہ وہ کسی بات پر بدک گئے اور کھچاکھچ بھری ہوئی بیٹھک میں ایک ٹمبر سمگلر پر برس پڑے: ''دیکھو پدّی کے بچے !! ڈی۔ ایس۔ پی............ نے آج تک ارسلان خان کہلوانے والے بدمعاشوں کو طوطا رام، فقیر چند بنا کے چھوڑا ہے۔ یاد رکھو میں بائیں ہاتھ سے تمہاری کھال کھینچ کر دائیں ہاتھ سے اس میں بُھس بھر دوں گا اور بھس کی قیمت تمہارے اُس لنگڑے بیٹے سے وصول کروں گا جو گاؤں کی مٹیاروں پہ آوازے کستا رہتا ہے۔ میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو؟؟''

ساری بیٹھک کو سانپ سونگھ گیا۔ میرے خیال کے پردے پر منعکس ہونے والا ظل الٰہی یکدم معدوم ہو گیا اور اس کی جگہ ایک مسکین حجام نے لی جس

کے ہاتھ ڈی ایس پی صاحب کی داڑھی نم کرتے ہوئے، صابن لگاتے ہوئے اور پھر اُسترا پھیرتے ہوئے رقصِ بسمل کا سماں پیش کرر ہے تھے۔ میری کیفیت دیکھتے ہوئے ڈی ایس پی صاحب مسلسل مسکراتے رہے۔ شیو کر چکنے کے بعد ان کی شان وشوکت اور جاہ وجلال دوبالا ہوگیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ ان کے سامنے واقعی شیر ببر بھیگی بلی بنتے ہوں گے۔ جب میں نے اجازت چاہی تو انہوں نے سو کا نوٹ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اپنے بائیں ہاتھ سے میرے دائیں کندے پر ایک پیار بھری دھپ جمادی لیکن میں سنبھلتے سنبھلتے بھی کم سے کم چار قدم لڑکھڑا ہی گیا۔ جب میں باہر نکلا تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سو کا نوٹ میرے ہاتھ کا پسینہ لگنے سے بالکل بھیگ گیا۔

پھر چند ہی دن بعد وہ اچانک مر گیا۔ (جس طرح یہاں آج کل لوگ اچانک ہی مرگِ مفاجات کا شکار ہو جاتے ہیں) میں جنازے میں شامل تو نہ ہو سکا لیکن بھیڑ چھٹ جانے کے بعد فاتحہ پڑھنے ضرور گیا۔ میں ابھی فاتحہ پڑھ ہی رہا تھا کہ ایک زرد رنگ کی مرغی اپنے دس پانچ ننھے ننھے چوزے لے کر کہیں سے آ گئی اور قبر کے عین اوپر پر پھُلا کے بیٹھ گئی اور چوزوں کو چھپالیا۔ ڈی ایس پی صاحب نے چوں بھی نہیں کی اور نہ ہی ''شی'' پکار کے مرغی کو بھگا دیا۔ بے شک جب جاہ وجلال مٹی کے نیچے پہنچ جاتا ہے تو مٹی ہی بن جاتا ہے جس کی سرنوشت کے ماتھے پر ''بے بسی'' جلی حرفوں میں رقم ہوتی ہے!'' یہ کہہ کر وہ نائی خاموش ہو گیا اور دیر تک کچھ بول ہی نہ سکا کیونکہ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

⁂

۶۲۔ سلوتری

میں نے میٹرک میں شاید پطرسؔ بخاری کے مضمون ''کُتے'' کو پڑھا تھا جس میں ایک لفظ استعمال ہوا تھا...... سلوتری...... ماسٹر جی کو شاید اس کے معنی معلوم نہیں تھے اس لئے وہ لفظ کو صاف ''گول'' کر گئے تھے۔ مجھے زبان و بیاں کے سلسلے میں تجسس کی لت پڑی ہوئی ہے، اس لئے میں کھوج بین میں لگ گیا۔ اُس زمانے میں لغات بڑے بڑے اداروں میں ہی ملا کرتے اور میں مدت تک ان اداروں سے دور ہی رہا۔ وہ آج کا زمانہ نہیں تھا، جس میں ہر پرائمری سکول کی دس کتابوں والی لائبریری میں بھی کئی لحیم وشحیم اُردو اور انگریزی ڈکشنریاں تین پائے کی میز پر گرد آلود حالت میں پڑی ہوئی ہوتی ہیں۔

ایک دن اللہ کا فضل ہوا اور بن پوچھے بن مانگے مجھے ''سلوتری'' کے معنی

معلوم ہو گئے۔ میں چونکہ علم کو چھپا کر رکھنے کا قائل نہیں اس لئے واقعہ سنا کر آپ کو بھی اِس معنی سے واقف کروں گا۔ (خدا کرے آپ کو بھی سلوتری کے معنی معلوم نہ ہوں تو ''مجا'' آئے گا۔)......ایک کسان کے دو بیٹے تھے۔ ''بڑا'' بدقسمتی سے زیورِ تعلیم سے ''آراستہ'' نہ ہو سکا کیونکہ والدین، دن کو کھیت کھلیانوں میں پسینہ بہاتے تھے اور رات کو پیٹ پر پتھر باندھ کر پڑے رہتے تھے۔ ایک دن میاں بیوی نے انقلابی فیصلہ کیا اور ''چھوٹے'' بیٹے کو حلقہ کے اکلوتے مڈل سکول میں درجِ رجسٹر کیا۔ بڑا بیٹا کھیتوں میں ہل چلاتا رہا، بوجھ ڈھوتا رہا اور فاقے کرتا رہا اور چھوٹا پڑھتا رہا اور نازوں سے پلتا رہا۔ پھر وہ بھی ''بڑا'' بن گیا یعنی ڈاکٹر ہوا اور ایک دن خاموشی سے ایک لیڈی ڈاکٹر کے ہاں ''گھر جمائی'' بن گیا۔ پھر بوڑھے والدین نے اس کو بہت ڈھونڈا، بہت منایا، بہت پچکارا لیکن وہ چونکہ اب ''چھوٹا'' نہیں رہا تھا، اس لئے بہل نہ سکا اور لیڈی ڈاکٹر کی تراشیدہ زلفوں کو سر کرنے میں لگا رہا۔ والدین ہر ڈوبتے سورج کے ساتھ مقامِ فنا سے نزدیک ہوتے گئے اور بڑا گنوار بیٹا حتی المقدور اُن کی رفاقت، کفالت اور خدمت کرتا رہا۔ انہوں نے اسے کچھ دینے کی بہت کوشش کی لیکن چھوٹے بیٹے کو ڈاکٹر بناتے بناتے ان کی زمین جائیداد سب بک چکی تھی۔ اس لئے وہ دعاؤں کے سِوا کچھ نہ دے سکے۔ پھر ایک دن دعائیں دیتے دیتے یکے بعد دیگرے اس دنیائے دوں سے دامن جھاڑ کر چل دیئے۔

رسمِ چہارم کی دھوم دھام کے لئے بڑے کسان بیٹے کے پاس پیسے نہیں تھے لیکن ڈاکٹر بیٹے نے ایسی دریا دلی سے مدد کی کہ ٹھسّے کا ''وازہ وان'' پکا اور یار لوگوں نے ڈٹ کر دعوت اُڑائی اور وہ بھی ایسی کہ وال ٹو وال قالینوں سے مزّین رنگ برنگے شامیانے کے اندر مہمانوں کے آگے ڈاکٹر لوگ دسترخوان بچھا رہے تھے، انجینئر ''ترامیاں'' ڈال رہے تھے، ڈاکٹرنیاں پانی کے گلاس لئے بادِ صبا کی طرح اٹکھیلیاں کرتی پھر رہی تھیں اور نکٹائیاں باندھے آشپز مہمانوں کے

سروں کے اوپر سے لذیذ خوشبودار ''وازہ وان'' کے ''چونچے'' (کفگیر) گھمارہے تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد جب مہمان گاؤتکیوں سے ٹیک لگائے گرم گرم حلوے کی پلیٹوں سے شغل کرنے لگے تو میزبان ڈاکٹر صاحب نے اونچی آواز میں فرمایا:

''بھئی! ماں باپ کو اپنے ایامِ جوانی ہی میں جنت کو سدھارنا چاہئے وگرنہ ایام پیری میں وہ بارِ دوش بن جاتے ہیں!'' یہ سن کر حاضرین وناظرین وسامعین سکتے میں آگئے لیکن ایک منہ پھٹ مہمان نے اسے یوں مخاطب کیا: ''بھائی صاحب! میں نے سنا تھا کہ آپ سلوتری ہیں لیکن یقین اس لئے نہیں آیا تھا کیونکہ آپ کی صورت اور لباس انسانی ہے اور آپ کبھی کبھی انسانوں کے ساتھ بھی بیٹھتے ہیں!'' ایک اور مہمان نے اس سے سوال کیا: ''جناب! سلوتری کے کیا معنی ہیں؟''۔

''سلوتری کے معنی ہیں مویشیوں کا ڈاکٹر!!'' اس نے جواب دیا۔

* * *

٦٣. غم نہ داری......

مشہور فارسی مثل ہے: ''غم نہ داری بزُ بخر''۔ (ترجمہ: ''اگر تمہیں کوئی غم نہیں ہے تو بکری خریدو''۔) خدا گواہ! مجھے بہت مدت تک یہ مثل سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ جناب! یہ بھی تُک ہے کہ کوئی ''بے غم'' ہے اور بکری خریدتے ہی ''باغم'' بن جائے۔ گویا بکری نہ ہوئی ایڈز کا جرثومہ ہوئی، اِدھر چھوا اُدھر بیماری لاحق ہوگئی اور وہ بھی لاعلاج۔ لیکن جس طرح ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے، (بغیر مسئلہ کشمیر کے) اسی طرح ہر مثل کی بھی کوئی عملی تشریح وتوضیح صفحۂ زمین پر ضرور درج ہوتی ہے۔

میرا ایک ہمسایہ ہے لون صاحب۔ لون صاحب کا ایک ہمسایہ ہے میر صاحب اور میر صاحب کا ایک ہمسایہ ہے پیر صاحب۔ ماہِ مبارک رمضان کے

متبرک ایام تھے کہ اچانک لون صاحب کی دودھیلی گائے مرگئی۔ ان ایام میں کسی کے گھر بھلے ہی مٹن پنیر نہ پکے لیکن افطار کے وقت دودھ، پانی، شکر سے تیار شدہ تخمِ ریحان ملا ہوا شربت میسر ہو تو بھوک پیاس کی حدت اور شدت کافور ہو جاتی ہے۔ اس طرح دودھ کی فراہمی اس مہینے میں اور بھی زیادہ اہم بن جاتی ہے۔ چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے لون صاحب نے فوری اقدام یہ کیا کہ ایک عدد دودھیلی بکری کی تلاش شروع کی۔ وہ تو نہ مل سکی لیکن ”بجائے سترِ عورت زچہِ رینژھا“ (ستر ڈھانپنے کے لئے کچھ بھی میسر نہ ہو تو پرانے کپڑے کا کٹا پھٹا ٹکڑا بھی غنیمت ہے۔) کے طور پر ساتھ آٹھ مہینے کی عمر کا ایک میمنہ اُٹھا لائے۔ پیر نہ سہی عصائے پیر سہی۔ شام کو یہ بکری کا بچہ لائے اور صبح تڑکے میر صاحب کے گھر سے شور بلند ہوا۔ میاں میمنے اُن کے کچن میں گھس کر پکے پکائے چاولوں کا دیگچہ صاف کر گئے تھے۔ بے چارے میر صاحب کے لب سوکھ گئے کیونکہ اس کی اہلیہ نے اپنے بچوں کو ہیلز لینڈ پبلک سکول (Hells Land Public School) بھیجنے کے لئے ان کے لنچ ٹفن ابھی تیار نہیں کئے تھے۔ وہ لوگ واہی تباہی بکتے ہوئے لون صاحب کے درِ دولت پر آ گئے اور ان کی خبر لی۔ وہ اُف بھی نہ کر سکے۔ آخر اگر بدبو ان کے گھر سے نکل رہی ہو تو وہ ہمسائے کو اپنی کھڑکی بند رکھنے کے لئے تو نہیں کہہ سکتے تھے!!۔

دوسرے دن پیر صاحب کے گھر سے شور و غوغا بلند ہوا کیونکہ لون صاحب کی پالی ہوئی ”بدعتِ حسنہ“ نے ان کے راشن پر منہ صاف کر لیا تھا۔ جو انہوں نے گھاٹ منشی کو پچاس روپے رشوت دے کر چھانٹ کے لایا تھا۔ پیر صاحب چونکہ امام مسجد تھے اس لئے گالی نہ دے سکے لیکن دیوارِ شرع کے پیچھے سے الفاظ کے وہ نوکیلے پتھر پھینکے کہ لون صاحب کا دل جگر پارہ پارہ ہو گیا۔ جواب میں لون صاحب اس لئے کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ جارحیت اُس کی طرف سے ہوئی تھی۔ اب وہ کوئی

جارج ڈبلیو بُش یا اوبامہ تو نہ تھا جو زمین پر ہر جگہ جارحیت کا ارتکاب کرتا ہے اور جارح نہیں کہلاتا!

تیسرے دن میروں اور پیروں کے ہاں تو خاموشی رہی لیکن فقیروں کے ہاں ہنگامۂ عظیم بپا ہوا۔ میمنے نے دروازے کے راستے کچن میں داخل ہو کر اپنا سر تانبے کی ہانڈی میں دے دیا تھا جس کا دہن چوہے دان کی طرح تھا کہ چوہے اِدھر سے تو داخل ہو سکتے ہیں لیکن اُدھر سے نہیں نکل سکتے۔ فقیروں نے جو ایک لٹھ جمایا تو میمنہ معہ ہانڈی کھڑکی کے راستے کود کر امیروں کے ٹین کے شیڈ میں جا پھنسا۔ ٹین کی دیواروں کے ساتھ ٹکرانے سے ”ٹھائیں ٹھوئیں“ شروع ہوئی اور سارا گاؤں بدحواس ہو کر گھروں سے نکل پڑا کہ مبادا بندوق برداروں نے ہلہ نہ بول دیا ہو۔ اُس روز تو لون صاحب کے منہ پر جیسے ناک ہی نہ رہی اور اس نے میمنے کو گھر میں باندھ کے رکھا پھر آنے والی بقرعید پر پیر صاحب سے فتویٰ لے کر اسے قربان کر دیا۔ میں نے پیر صاحب سے تعرض کیا: ”جناب محترم! قربانی کے لئے بکری کی عمر ایک سال سے کم نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن اس میمنے کی عمر تو ایک سال نہیں تھی۔ پھر آپ نے یہ کیا کیا؟!“ متبسم ہو کے فرمایا: ”میاں! یہ بات مجھے بھی معلوم ہے۔ واقعی میں نے ایک گناہ کیا، لیکن ساتھ ہی دو ثواب بھی تو کمائے!“۔

”وہ کیسے!؟“ میں نے پوچھا۔

”اولاً میں نے عوام الناس کو بکری کے شر سے بچا لیا۔ ثانیاً لون صاحب کو روز روز کی خفت اٹھانے سے نجات دی!“۔

”تو کیا فرماتے ہیں قارئین کرام بیچ اس مسئلے کے؟“ یہ میرا سوال ہے۔

* * *

۶۴. قاتل دورِ جاہلیت کے

عورت جنم داتا ہے۔ اس لئے اس کے حصے میں فقط احترام آنا چاہئے اور بس! لیکن تاریخ عالم شاہد عادل ہے کہ یہ ہمیشہ نفرت، ظلم، ستم اور بے دردی کا شکار رہی ہے۔ اس کی کوکھ سے جنم لینے والوں اور اسی کے خون کو چوس چوس کر تنومند ہونے والوں نے بھی اس کو نہیں بخشا۔ لیکن بے بسی چونکہ اس کی پیشانی پر درج ہے، اس لئے کبھی اُف بھی نہ کر سکی۔ اسلام نے اس کی بے بسی کی طرف تاریخِ انسانی میں پہلی بار نظریں اٹھائیں اور یہ محترم بن گئی۔

روایات میں آیا ہے کہ ایک بار ایک صحابیؓ نے دربارِ رسالتؐ میں زمانۂ جاہلیت میں اپنی بیٹی کو زندہ دفن کرنے کی داستان کچھ یوں عرض کی: ''...... میری وہ چھوٹی سی بیٹی مجھ سے بہت مانوس تھی اور میں اس کے بغیر پل بھر کے لئے بھی نہیں

رہ سکتا تھا۔ لیکن فرمانِ جاہلیت کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے ایک کالی رات کو میں نے پھاوڑا لیا اور اس کا ننھا ہاتھ پکڑ کر کالے صحرا کی راہ لی۔ میں چلتا گیا اور وہ بار بار مجھ سے اپنی توتلی زبان میں پوچھتی رہی ''ابا! آپ مجھے لے کے کہاں جارہے ہیں؟'' میں نے اس کے معصوم سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک مناسب جگہ پہنچ کر میں نے گڑھا کھودا اور اسے اس میں ڈال دیا۔ میں اوپر سے ریت ڈالتا گیا اور وہ ''ابا ابا'' پکارتی رہی یہاں تک کہ وہ پکار زمین کی کوکھ میں جذب ہوگئی۔ میں نے گھر کی راہ لی ''ابا ابا'' کی نہ سنائی دینے والی آواز کسی عفریت کی طرح میرا تعاقب کرتی رہی۔ اے اللہ کے رسولؐ! کیا میرے لئے بخشش کی کوئی راہ ہے!؟'' لیکن رحمتہ للعالمینؐ جواب میں آنسو بہاتے رہے یہاں تک کہ ان کی ریش مبارک تر ہو گئی۔ حضورؐ کے حزن وملال کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے صحابیؓ کو ڈانٹا کہ ''خاموش رہو، تم نے اللہ کے رسولؐ کو محزون کردیا!'' لیکن حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو اشارے سے خاموش رہنے کا حکم دیا اور صحابیؓ سے داستان دہرانے کے لئے کہا۔ داستان گو صحابیؓ داستان سناتے رہے اور دامنِ رسالتؐ پر آنسوؤں کے موتی لڑھکتے رہے۔

آج کے مسلم معاشرے میں کوئی بھی ایسا شقی القلب مرد نہیں جو بہن، بیٹی، بہو، بیگم کو زمانۂ جاہلیت کی طرح زندہ دفن کرلے۔ وہ بس اپنے ماں باپ کی وفات کے بعد زمین جائیداد کا وہ حصہ داب لیتا ہے جو اسلام نے ''بہن'' کے لئے مخصوص رکھا ہے اور کسی بھی مبنی بر خودغرضی تاویل سے بھائیوں کے لئے حلال وطیب نہیں ہوسکتا۔ کوئی بہن قیل وقال سے کام لے تو ہتھکنڈوں کے ٹیپ اُس کے کمزور ہونٹوں پر چپکا کر اسے خاموش کردیا جاتا ہے۔ کیا یہ قتل ہے!؟

بیٹی کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا خدا اور رسولؐ کا حکم ہے لیکن ہم اسے کولھو کا بیل بنا کر گھر گرہستی اور اس سے وابستہ دوسرے کاموں میں اُلجھا کر اس کے خون پسینے سے گھروں کے در ودیوار پر گلکاریاں کرتے ہیں اور ایک مدتِ مدید

کے بعد اسے کسی کے سر منڈھ کر سکون و اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ وہ میکے میں ''ان پڑھ''، ''جاہل''، ''گنوار'' وغیرہ قسم کے طعنے سہہ سہہ کر ایک دن زمین میں منہ چھپاتی ہے۔ کیا یہ قتل ہے!؟

ہم بہو کو لاکھوں کا جہیز نہ لانے کی صورت میں اس کا قافیۂ حیات تنگ کرتے ہیں۔ قافیہ تنگ ہوتے ہوتے ایک دن یا تو اس کا دَم گھٹ جاتا ہے یا وہ خودکشی کرتی ہے۔ کوئی بہو سخت جان واقع ہو تو اس پر کیروسین چھڑک کر یا گیس سلنڈر کا دہانہ کھول کر اُسے ماچس کی تیل دکھاتے ہیں۔ کیا یہ قتل ہے!؟

بیگم سحر خیز موذّن کی آواز کے ساتھ ہی گرہستی کی بھاری چکّی چلانا شروع کرتی ہے۔ جب رات ادھیڑ ہو جاتی ہے تو چکی پھر بھی ''گھرر گھرر'' گھومتی رہتی ہے۔ ہم اس کے باوجود اُسے اپنے پاؤں دابنے کے لئے کہتے ہیں۔ وہ پاؤں دابتے دابتے ایک دن ملکِ عدم کی لمبی چھٹی پر چلی جاتی ہے۔ کیا یہ قتل ہے!؟......

کیا اکیسویں صدی کا ترقی یافتہ اور ذہنی و دینی طور سے بیدار تر مسلمان قتل کر سکتا ہے!؟...... جناب! عورتوں کا قتل تو زمانۂ جاہلیت کے عرب کرتے تھے جن کے دل اور دماغ ریگستانوں کی گرمی کھانے کے سبب سیاہ ہوا کرتے تھے!!!

* * *

۶۵. غور طلب

نادر شاہ درانی تاریخ کے بدنام ترین اور رسوائے زمانہ اشخاص میں سے ایک ہے۔ 11 / مارچ 1739ء کو اپنے چند سپاہیوں کے قتل سے مشتعل ہو کر اُس نے دلی میں ''بزن و بکش'' کا حکم دیا تو اس کی فوج نے محض چند گھنٹوں میں کوئی تین لاکھ انسانوں کو قتل کیا لیکن انتقام کی آگ تھی کہ اس کے سینے میں پھر بھی دہکتی رہی۔ ہر سو آہ و فغاں اور چیخ و پکار کا عالم تھا لیکن نادر شاہ اس سے بے نیاز اپنی آتشِ انتقام کو خون کی چھینٹوں سے بجھانے پر مصر تھا۔ اس سیلاب کو پار کرتے ہوئے نظام الملک نے اس کے سامنے دست بستہ یہ شعر پڑھنے کی جرأت کی ؎

کسے نہ ماند کہ او اِ بہ تیغِ ناز کشی
اِلّا کہ زندہ کُنی خلق را و باز کشی

(اے شہنشاہ! اب کوئی بھی انسان نہ بچا جسے آپ اپنی تیغ ناز سے مار سکیں۔ بس ایک ہی صورت ہے کہ آپ لوگوں کو دوبارہ زندہ کریں اور پھر مار دیں۔)

اس شعر کی قرأت اور ردِّ عمل سے یہ عندہ ملتا ہے کہ نادر شاہ ایک انتہائی خوں آشام اور خونخوار شخص ہونے کے باوجود اپنے اندر خدا ترسی کا کسی نہ قدر شائبہ ضرور رکھتا تھا۔ اس نے شعر سنا۔ اس کو سمجھا اور اس کے ضمیر کے چوابدار نے اُس کے سر پر ضربِ شدید رسید کرتے ہوئے کہا: "بے شک تم وقت کے فرماں روا ہو اور تم کچھ بھی کر سکتے ہو کیونکہ خلقِ خدا تمہارے آگے بے بس ہے لیکن تم اتنے قوی کبھی نہیں ہو سکتے کہ لوگوں کو مارنے کے بعد زندہ کر سکو کیونکہ قوتِ تخلیق اللہ نے اپنے دست قدرت میں رکھی ہے۔ اس لئے ڈرو اُس اللہ سے جو جواب لینے میں بھی اتنا ہی سخت ہے جتنا رحم دلی میں فیاض ہے!" یعنی بقول شاعر؎

ناکردہ گناہوں کے تڑپتے ہوئے لاشے
اے صاحبِ تلوار! خدا دیکھ رہا ہے

نادر شاہ کے پاس لوگوں کو قتل کرنے کے لئے پھر بھی ایک جواز تھا کیونکہ اُس کے چند سپاہیوں کو "بلا جواز" قتل کیا گیا تھا۔ لیکن آج کے انسان کے پاس اپنے ہم جنسوں کو قتل کرنے کے لئے نہ تو کوئی جواز ہے اور نہ دلیل۔ وہ بس قتل کر رہا ہے...... بلا جھجک، بلا خوف، بے دریغ اور بے درنگ! کوئی اس کے سامنے اشعار کے بجائے مقدس صحیفوں کی آیات کی بھی قرأت کرتا ہے لیکن وہ متاثر ہونے کے بجائے نفرت اور حقارت سے منہ پھیر لیتا ہے اور آیات کا انکار کرتا ہے۔ اب جو شخص آیات کا انکار کرے، اس کے پاس انکار کی صرف دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ مخلوق کو پیدا کرنے اور ان سے اعمال کا حساب لینے والے کے وجود کا منکر ہے اور اپنے آپ کو جوابدہی کے تصور سے بے نیاز اور بلند و بالا خیال کرتا ہے۔ دوم اُس میں لوگوں کو پیدا کرنے، انہیں مارنے اور پھر زندہ کرنے کی

صلاحیت پیدا ہوگئی ہے اور وہ خدا بن گیا ہے۔ اگر یہ دو چیزیں نہیں تو پھر آج ہر جگہ اُس کے ہاتھوں انسانی خون پانی کی طرح کیوں بہہ رہا ہے؟؟ اس پر حضرت انسان کو لازمی طور پر غور کرنا چاہئے!!

⁂

٦٦. کِٹرِن

وہ بہت ہی بُری عورت تھی۔ [لوگوں کا خیال تھا، حقیقت اللہ جانے] پستہ قد، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، مختصر سے کان اور ناک، نوکدار ٹھوڑی، پتلے ہونٹ جن پر وہ اکثر اپنی پتلی زبان پھیرتی رہتی تھی، گیہواں رنگ اور جھریوں بھرا چہرہ۔ پہلی ہی نظر میں وہ شیطان کی خالہ لگتی تھی۔ اُس کے اوصافِ رذیلہ میں چند باتیں بہت زیادہ نمایاں تھیں۔ وہ اتنی زبان دراز تھی کہ اس کی زبان کے وار سہتے سہتے اس کا میاں ادھیر عمر میں ہی ملک بقا کے لئے سدھار چلا تھا۔ میاں کے چل بسنے کے بعد اس کی راہ کا آخری کانٹا بھی ہٹ چکا تھا'ور وہ رذالت کی راہ پر بگٹٹ دوڑی چلی جارہی تھی۔ روک ٹوک کے لئے ایک بیٹا تو زمین کے اوپر تھا لیکن وہ اس سے پِنڈ چھڑا کے دوسرے گاؤں میں ایک کسان کا گھر جمائی بن گیا تھا۔ زبان درازی کو

لوگ باگ تو سہہ ہی لیتے تھے لیکن وہ بی جمالو قسم کی عورت بھی تھی کہ ایک گھر سے بات کی بھنک لے اڑی اور شام ہونے سے پہلے اسے گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچادیا۔ ساس سے سنی اور بہو کے کان میں ڈالی۔ بہو سے سنی اور ساس کے حلق میں اُتار دی۔ میاں سے اُگلوائی، بیوی کو رٹائی۔ بیوی سے کہلوائی اور میاں کے جگر میں بسا دی۔ وہ اس سلسلے میں ناشتہ کرتے ہی گاؤں کی گلیوں گلیاروں میں ٹوہ لیتی پھرتی۔ بس دو عورتوں کو ایک جگہ جمع دیکھا اور فوراً اُن میں اپنا اضافہ کرلیا۔ کوئی مرد یا عورت بات کرنے کے لئے نہ ملتی تو درّانہ کچن آنگن میں گھس آتی اور کسی وکیل یا جاسوس کی طرح لچھے دار باتیں کر کے اسے اس طرح ہوا دیتی کہ کوئی بھی سر پھٹول کی واردات ایسی نہ ہوتی جس میں اس کی لگائی بجھائی کو مرکزی اہمیت حاصل نہ ہوتی۔

بات یہ نہیں کہ لوگوں کو اس کے عیوب سے پیار تھا یا وہ لوگوں پر حاوی ہوگئی تھی بلکہ بات یہ تھی کہ لوگ ایک بوڑھی کھوسٹ بیوہ کے منہ لگنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اسلئے اسے دیکھتے ہی مردوں کی اکثریت کانا پھوسی کرنے لگتی کہ ''لو آ گئی، لو آ گئی''۔ خاندانی عورتیں بھی اسے پسند نہیں کرتی تھیں لیکن اس چسکے میں ان کی اس کے ساتھ نبھ ہی جاتی تھی کہ انہیں بنا اخبار رسالہ پڑھے تازہ بہ تازہ خبریں سننے کو ملتیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ متفقہ طور سے لوگوں کی نظروں میں کسی ملک کے ناپسندیدہ سیاست کار کی طرح مردود اور مستحقِ نفرت وملامت تھی۔

پھر ایک دن وہ اچانک مرگئی...... بالکل اُسی طرح جس طرح عام لوگ مرتے ہیں۔ سارے گاؤں نے اطمینان وسکون کا ایک مشترکہ لمبا سانس لیا۔ اس کی تجہیز وتکفین کا کام شام سے پہلے مکمل کر کے لوگوں نے بھاگم بھاگ گھر کی راہ لی جیسے انہیں اس کے لوٹ آنے کا خوف لاحق ہو۔ خوب سیر ہو کے مزے لے لے کر کھانا کھایا اور گھوڑے بیچ کر سو گئے لیکن سرپنچ کے گھر پر تو جیسے عید تھی۔ وہاں اتنی

دھماچوکڑی مچی جیسے ان کے بیٹے کی شادی ہو۔ پھر رات گئے منڈلی برخاست ہوئی اور سرپنچ نے گاؤ خانے کا دروازہ کھول دیا تاکہ مال مواشی کے چارے پانی کا جائزہ لے سکے۔ اس کا دروازہ کھولنا تھا کہ پھونس کا ہلکا سا تنکا اس کی دائیں آنکھ میں اٹک گیا۔ پہلے تو وہ آنکھ مسل مسل کر تنکے کو نکالنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن تنکا نہ نکل سکا۔ اُس نے دروازہ واپس بھیڑ دیا اور اندھوں کی طرح ٹٹولتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ ہر کس و ناکس نے آنکھ سے تنکا نکالنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ الٹا ملنے سے آنکھ کی سرخی، سوجن اور جلن بڑھتی گئی۔ وہ فرش پر لوٹنے لگا۔ اچانک کسی نے ''کِٹرِ ٹن[1]'' کو بلانے کی بات کی تو سب کی جان میں جان آگئی اور سرپنچ صاحب تو جیسے زندہ ہو گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ اُسے بلانے کے لئے کسی تیز رفتار آدمی کو دوڑایا جاتا، سبھوں کی زبان سے بیک وقت نکلا...... ''ارے! اُسے تو ہم لوگ ابھی ابھی اپنے ہاتھوں سے دفنا کے آ گئے ہیں۔ ہائے افسوس! اب لوگوں کی آنکھوں کے تنکے کون نکالے گی!؟'' وہ تو ایسے نکالتی تھی جیسے مکھن میں سے بال۔ بس آنکھ میں اپنی پتلی زبان کی نوک پھیرتی تھی اور آنکھ میں ٹھنڈک پڑتی تھی...... افسوس! ہائے افسوس!!''

---

[1] آنکھ میں اٹکے تنکوں کو نکالنے والی عورت۔

⁂

شائع شدہ ہفت روزہ ''احتساب'' سرینگر   شائع شدہ عالمی ماہنامہ ''انشاء'' کلکتہ۔

(مختصر افسانہ)

٦٧۔ شکستِ آرزو

لوگ کہتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تاریک لمحوں میں اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ سکینہ کے والدین ایک سڑک حادثے کی نذر ہو گئے اور وہ جوانی کا بھاری بوجھ سر پر لئے اپنے چچاؤں اور ماماؤں کی بھیڑ میں اکیلی رہ گئی۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے، نہ دائیں نہ بائیں۔ اوپر پناہ نہ دینے والا آسمان اور نیچے اپنی کوکھ میں سمونے کے لئے برقرار بھوکی زمین..... لڑکی چونکہ باہمت اور غیرت مند تھی، اس لئے تمام تلخیوں کو چادر کی طرح اوڑھ کو جینے کی ترکیبیں کرنے لگی۔ کر

وہ ایک مقامی سکول میں ٹیچر ہوئی۔ باپ اگرچہ دکاندار اور ماں گھریلو عورت تھی لیکن انہیں نہ جانے کیا سوجھی تھی کہ اسے ایم۔ اے، بی۔ ایڈ کرایا تھا،

جس کی وجہ سے اُسے ملازمت اور جینے کا سہارا تلاش کرنے میں کوئی خاص جدوجہد نہیں کرنا پڑی۔ لیکن عام خیال ہے کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ یعنی:

Misfortune , never comes alone

اس لئے ایک اور مصیبت اس کے لئے یہ کھڑی ہوئی کہ وہ آدم پور کے ایک فروٹ مرچنٹ کے بیٹے ساجد جمیل خان کو دل دے بیٹھی۔ یہ مصیبت تو نہیں تھی کیونکہ دل کا لین دین ایک آفاقی حقیقت اور شدید ترین انسانی جبلت ہے۔ لیکن ایک بے سہارا غریب لڑکی کا اس شخص کو دل دینا بدترین مصیبت ہے جو سونے کی لنکا میں رہتا ہو۔ اس لئے جہاں ہر چیز چاندی سونے کی ہو وہاں شیشے کے دل تلاش کرنا ایک کارِ لاحاصل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ساجد جمیل نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا لیکن وہی پرانا کھیل نئی طرز پر کھیلا جانے لگا کہ دولہے میاں کے باپ نے اعلان کیا کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا اور ہرگز نہیں لگ سکتا۔ اکلوتی اولاد چونکہ ماں باپ کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے، اس لئے ساجد نے اسی کمزورنس کو دبا کر جواب دیا:

”میں شادی کروں گا تو سکینہ سے ورنہ گھر سے بھاگ کر سرحد پار جاؤں گا اور بندوق لا کر سب کا جینا حرام کر دوں گا!!“...... اب ان دنوں کشمیر میں کوئی چاہے سرنگ، گرینیڈ، گولی کے وار سے بچ جائے لیکن دھمکی سے نہیں بچ پاتا کیونکہ اس کے اثرات بڑے خوفناک اور دُوررس ہوتے ہیں جن میں سیکورٹی فورسز کی پکڑ دھکڑ سب سے ہولناک ہوتی ہے...... ”کیوں بھاگا؟ کیسے بھاگا؟ تم نے بھاگنے کیوں دیا؟ بھاگ کر واپس کب آئے گا؟ آئے گا تو اسے ہمارے سپرد کب کرو گے؟..... پھر سلاسل کی جھنکار، انٹروگیشن کی مار، بے بسی کی پھٹکار اور کیا نہیں!؟؟

ماں باپ کمزور پڑ گئے لیکن اپنی ساکھ کو بچانے کے لئے سونے کی زمین پر چاندی کی دیوار کھڑی کرتے ہوئے ایک شدید شرط رکھ دی...... ”شادی منظور لیکن جہیز تین لاکھ روپے ضرب ڈبل اور وہ بھی علی الاعلان نہیں بلکہ خفیہ طریقے سے کہ کسی کو

کانوں کان خبر نہ ہو سکے!'' دِل والے بڑے سر پھرے ہوتے ہیں، اس لئے چٹانوں کا جگر چیر کر دودھ کی نہر لانے کی شرط قبول کرتے ہیں۔ ساجد اور سکینہ اگر چہ شرط سن کر پتھرا کے رہ گئے لیکن سکینہ نے نہ جانے کیسے اور کس طرح کہا: ''مجھے شرط منظور ہے!!'' حالانکہ اس کے پاس مقررہ مدت یعنی ایک سال میں محض ایک لاکھ جٹانے کی بھی استعداد اور اہلیت نہیں تھی۔ اس نے اُسی روز سے کولہو کے بیل کی طرح دن رات کام کرنا شروع کیا...... صبح ساڑھے نو بجے تک مختلف جگہوں پر بچوں کو پڑھانا، چار بجے تک سکول کی ڈیوٹی، ساڑھ چار سے رات کے دس بجے تک ایک کمپیوٹر سینٹر اور ایک پرائیوٹ کوچنگ سینٹر چلانا، رات کو نہ جانے کب تک کمپیوٹر ٹائپنگ اور نہ جانے کیا کیا؟

وہ سال کا آخری دن تھا۔ اس نے اپنے بینک اکاؤنٹ کی بڑی احتیاط سے پڑتال کی۔ بیلنس کے طور پر پورے تین لاکھ جمع ہو چکے تھے۔ اس نے ایک لمبی آسودہ سانس کے ساتھ لمبی انگڑائی لی اور ٹی۔ وی آن کر کے بستر پر دراز ہو کر مستقبل کی جنت میں خیالوں کی ریشمی پتنگ اُڑانے لگی لیکن اچانک اس کی ڈور ٹوٹ گئی۔ شام کی خبروں میں لیڈی نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی ...... ''ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ نامعلوم افراد نے ''اُمید نگر'' چوک میں ایک گرینیڈ داغا، جس سے پندرہ لوگ زخمی اور ایک نوجوان ہلاک ہوا۔ ہلاک شدہ نوجوان کی شناخت آدم پور کے ساجد جمیل خان کے طور پر ہوئی ہے..........''

سکینہ اپنے بستر پر ساکت و جامد ٹی۔ وی سکرین کو پھٹی آنکھوں سے تکتی رہی۔ اس کے متعلق وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مردہ!!''

(۱)۔ شائع شدہ ہفت روزہ ''احتساب سرینگر''
5رجنوری تا 11رجنوری 2009ء
(۲)۔ شائع شدہ عالمی ماہنامہ ''انشاء'' کلکتہ
مارچ، اپریل 2009ء

(مختصر افسانہ)

آئینہ نما

مکتوب-1

(از جناب پروفیسر جگن ناتھ آزاد)

A-25, Govt. Quarters,
Gandhi Nagar, Jammu -Tawi, Dated: 20-6-2000
180004.

محبّ مکرم عبدالرحمٰن مخلص صاحب، آداب۔

کل کی ڈاک میں آپ کا عنایت نامہ ملا اور آپ کی تصنیفِ لطیف ''دعوت فکر'' بھی۔ تہہ دل سے شکر گزار ہوں ع

من بہ بوئے مست و ساقی پُر دہد پیمانہ ہا!

(ترجمہ: میں تو شراب کی بُو سونگھ کر ہی مست ہوا تھا اور ساقی پیمانے بھر بھر کے دے رہا ہے۔)

کل ہی ایک نظر ڈالنے کے لئے کتاب کی ورق گردانی شروع کی تو اس کے ایک ایک باب کی ایک ایک سطر نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں نے ایک ہی

نشست میں کل آٹھ ابواب پڑھے۔ اول سے آخر تک اور دلی طور سے متاثر ہوا۔ نفسِ مضمون تو ہر باب کا اعلیٰ وارفع ہے ہی، آپ کا اندازِ بیاں بے حد دلکش ہے اور دل میں اُتر جانے والا ہے۔ آپ تو صفِ اوّل کے انشا پرداز ہیں۔ یہ میری محرومی ہے کہ آپ بھی جموں کشمیر میں ہیں اور میں بھی جموں کشمیر میں لیکن آج تک میں آپ کے اسم گرامی سے واقف تھا اور نہ ہی آپ کے گراں قدر کام سے ع

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجئے!

باب بعنوان ''عشق رسولؐ'' کی آخری سطور نے تو دل دہلا دیا۔ ''پاسنگ'' کے آئینے میں ملک کے بیوروکریٹس کی نوے فیصد تعداد اپنا چہرہ دیکھ سکتی ہے۔ ''حسن کلام'' کا بھی کیا کہنا! ''کردار کا انحطاط'' میں آپ نے مجسمۂ جہل وفریب کو خوب آڑے ہاتھوں لے لیا ہے اور پھر میں تو آپ کے حسنِ بیان اور حسنِ کلام کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ادب میں ''کیا کہا ہے'' کی اہمیت ہے لیکن صرف ''کیا کہا ہے'' سے ادب تخلیق نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ''کیونکر کہا گیا ہے'' کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ آپ کے یہاں یہ دونوں محاسن اس طرح یک جان ہو گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ کس کس باب کی تعریف کروں۔

زفرق تابقدم ہرکجا کہ می نِگرم
کرشمہ دامن دِل می کشد کہ جا ایں جاست

(ترجمہ: محبوب کی پیشانی سے قدم تک جہاں بھی نظر ڈالتا ہوں، کرشمہ دامنِ دل کو کھینچ کے کہتا ہے کہ ''جگہ یہاں ہے۔'')

اگرچہ آپ کی اِس تصنیفِ لطیف میں اوّلین مخاطب مسلمان ہی ہیں لیکن یہ کتاب ہمارے ملک میں بلکہ برصغیر میں ہر فرد کے لئے اتنی ہی مفید ہے جتنی مسلمانوں کے لئے۔ جزاک اللہ!

میں ان مضامین کی تصنیف اور انہیں مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کرنے پر دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

خداوند کریم آپ کو خوش وخرم رکھے!

خیراندیش
جگن ناتھ آزاد

جناب عبدالرحمٰن مخلص
سیر جاگیر، سوپور، کشمیر، 193201

(برصغیر کے صف اوِل کے ماہر اقبالیات، شاعر، ادیب، نقاد جناب جگن ناتھ آزاد کا اوّلین مکتوبِ گرامی)

* * *

مکتوب نمبر-2

از جناب محمد یوسف ٹینگ صاحب
ایم ایل سی
Mohd. Yousuf Taing.
(M.L.C)
Author and Journalist

سرینگر:
2/ستمبر 2000ء

جناب مخلص صاحب! سلام مسنون:

آپ کا تحفۂ اخلاص کل ہی ملا۔ ممنون ہوں کہ آپ نے اس چھوٹے سے آدمی کو اس ارمغان کے لائق سمجھا اور پھر رجسٹری وغیرہ کر کے اتنی زحمت اٹھائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا تخلص واقعی آپ کیلئے ہی مخصوص ہونا چاہئے تھا۔

کتاب کے اوصاف بہت ہیں۔ صاف، شفاف اور خوبصورت۔ انشا اور املا درست اور من کو بھاتے ہوئے۔ جن مضامین پر آپ نے قلم اٹھایا ہے، وہاں عمدہ سے عمدہ نکتے بڑی سلاست سے بیان فرمائے ہیں۔ کشمیر میں اتنی شستہ اور اچھی اُردو نثر لکھنے والے خال خال نظر آتے ہیں۔ خیال اور بیان ایک دوسرے کی وقعت بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ کسی نثری کارنامے کی اس سے زیادہ خوبی اور کیا ہونی چاہئے۔

اگر اجازت دیں تو از راہِ اخلاص اپنی ایک ایسی رائے کا اظہار کروں گا جو شاید آپ کے لئے خوشگوار نہ ہو۔ چونکہ آپ نے بڑی محبت سے یہ تحفہ بھیجا ہے حالانکہ ہماری باقاعدہ دعا سلام بھی نہیں۔ لہٰذا مجھے لگتا ہے کہ یہ رائے چھپا کر میں آپ کے ساتھ ساتھ آپ کی احباب نوازی کا حق بھی ادا نہ کروں گا۔ کاش آپ نے یہ کتاب کشمیری زبان میں لکھی ہوتی تو صرف یہی کتاب لکھ کر آپ اس کے اچھے ادیبوں کے کاندھوں سے کاندھا ملا کر کھڑے ہو جاتے۔ اس زبان میں ایسی لطیف چیزوں کی کمی ہے۔ لیکن خیر پھر کبھی سہی...... دُکھ یہ ہے کہ اُردو کے سمندر میں کاغذ کی یہ چھوٹی ناؤ اپنا پورا حق وصول نہیں کر پائے گی۔

کتاب میں برمحل اشعار، برجستہ تمثیلات اور مناسب Quotes کا استعمال آپ کے علمی تبحر کا پتہ دیتا ہے۔ لہجے میں ہر جگہ شائستگی اور خوش مزاجی ہے۔ آپ کے ہر خیال سے کوئی اتفاق کرے، وہ اتنا ضروری نہیں لیکن بہر حال آپ کی لطافتِ اظہار اور شرافتِ تخیل کا قائل ہو ہی جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے بھی زیادہ بھر پور کارناموں کی تکمیل کی توفیق عطا کرے۔

کبھی دو بدو ملاقات ہوئی تو اور بھی قیل وقال ہو گی لیکن فی الحال میں آپ کی اس غیر متوقع عنایت کا شکر گزار ہوں ع

خورشید سا پیالہ مے بے طلب دیا

اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔

نیاز مند

محمد یوسف ٹینگ

جناب عبدالرحمٰن مخلص

ریٹائرڈ لیکچرار

سیر جاگیر، سوپور، کشمیر، 193201

(ریاست جموں و کشمیر کے بلند پایہ ادیب، صحافی، دانشور، محقق اور ناقد جناب محمد یوسف ٹیگ صاحب کا اوّلین مکتوبِ گرامی)

⁂

مکتوب نمبر-3

(از جناب محمد یوسف ٹینگ صاحب)

سرینگر
دوئم ماہِ رمضان
29/اکتوبر 2003ء

اخلاص مجسم جناب مخلصؔ صاحب!
السلام علیکم:

آپ کی دوسری کتاب ”زندگی کے رنگ“ میں نے فرمائش سے حاصل کی تھی۔ تب سے اس کا ایک ایک شذرہ روز پڑھتا ہوں۔ جیسے شرابِ طہور کا ایک ایک جام۔ آپ بہت دل کو لگتے ہوئے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر بہت ہی استادانہ اختصار کے ساتھ اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ چونکہ بات اخلاص اور شفقت سے کہی جاتی ہے لہٰذا قاری کو اپنے بہاؤ میں لے کر اپنا آپ منوا کے رہتی ہے۔ میں اگر اس کیفیت کیلئے مرزا سودا کا یہ مست شعر استعمال کروں تو اس کے

تلاذ موں

ظاہری تلاندوں سے صرفِ نظر فرمائیے ۔

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

خوبی یہ ہے کہ اندازِ بیاں سلیس ، لطیف ، مہذب اور پاکیزہ ہوتا ہے ۔ (کتاب کے ٹائٹل کے رنگ میں جو شوخ رنگینی ہے ۔ وہ بہت دلاویز ہے) حیرت ہے کہ اتنی شستہ اور شائستہ اُردو لکھنے والے کی ایسی پذیرائی نہیں ہو رہی ہے ، جتنی ہونی چاہیئے ۔ اس کی وجہ شاید خود اچھی اُردو نویسی کی تیزی سے گرتی ہوئی صورتحال ہے ۔ بہر حال مستقبل میں آپ کی کتاب اس بات کی خاموش شہادت پیش کرنے کیلئے موجود رہے گی کہ اخلاق ، شرافت اور انشاء کی موجودہ تخریب وتباہی کے دور میں ان سب خوبصورت قدروں کو قائم رکھنے والے ادیب بہر حال اپنا فرض نبھا رہے تھے ۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں کبھی آپ سے ملاقات کی فرحت سے شرابور نہیں ہوا ہوں ۔ لیکن اگر آپ کی متانت اور شرافت مآب تصویر آپ کی کتاب کی زینت نہ بھی ہوتی تو بھی آپ کی طرزِ نگارش اور انتخابِ مضامین سے ایسی ہی شبیہ میرے چشمِ تصور کے سامنے اُجاگر ہوتی اور اُبھرتی اور یہ شعر گنگناتی ۔

من کہ پنہاں می شدم مانندِ بُو در برگِ گل
ہر کہ دارد میلِ دیدن ، در سخن بیند مرا

(ترجمہ : میں خوشبو کی طرح پھول کی پتی میں چھپ گیا ہوں ۔ جسے مجھے دیکھنے کی رغبت ہو ، وہ مجھے میرے کلمہ کلام میں دیکھ سکتا ہے ۔)

میری یہ رائے البتہ بدستور ہے کہ یہ ، ندازِ بیان اور یہ فہم وتدبر سخن کشمیری زبان میں زیادہ مقبول اور کارگر رہتا...... ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا ہے ۔ اگر آپ اپنی کتابوں میں ذرا غور سے انتخاب کر کے ان کا کشمیری ترجمہ کر کے انہیں کتابی صورت میں چھاپیں تو بڑی عمدہ صورت سامنے آئے گی ۔ مجھے یقین ہے کہ آپ

کے قلم میں کشمیری عبارت واشارت کا والہانہ بحرِ فصاحت رچا بسا ہے اور بس کسی لرزش کا منتظر ہے تا کہ وہ اس چھوٹی سی زبان کے کوہ ودامن پر جھر جھر برس کر انہیں نہال اور خوشحال بنادے ع

ژۂ لاگکھ سورمۂ چشمن مہٕ گِژھہ ہے دل وُبٲلی

(ترجمہ: اے محبوب! تو آنکھوں میں کاجل بھرتا کاش! تا کہ میرا دل دیوانہ ہوجاتا۔)

مہربانی کرکے یہ خیال دل میں نہ لائیے کہ اُردو سے میں محبت نہیں کرتا۔ میں تو صرف موجودہ حقائق کے حوالے سے ایک دوستانہ تاثر ظاہر کررہا ہوں۔

میں اب چھ ماہ کے لئے جموں جارہا ہوں۔ میرا پتہ میرے پہلے خط پر درج ہے۔ کبھی جموں سے گزر ہو تو میرے غریب خانے کو ضرور سرفراز فرمائیے اور اگر کبھی قلمی نوازش کرنا چاہیں تو کیا کہنے۔ ایک اور بار کتاب کی ارمغان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

نیازمند
محمد یوسف ٹینگ

* * *

مکتوب نمبر-4

(از جناب محمد یوسف ٹینگ صاحب)
3- تلسی باغ، سرینگر
15 جون 2004ء

صدیق مکرم جناب مخلصؔ صاحب

سلام مسنون!

آپ کا نوازش نامہ ملا ۔ آپ کو دیکھنے اور آپ سے بالمشافہ گفتگو کی تمنا تھی ۔ لیکن ہماری دعاؤں کی طرح ہماری تمنائیں بھی بانجھ ہوگئی ہیں ۔ یہی غنیمت ہے کہ نیم ملاقات ہوئی ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت وامان سے رکھے اور آپ کے قلم کا نورانی فوآرہ اچھلتا اور مچلتا رہے ۔

آپ کے تخلص کی طرح آپ کی عبارت سے بھی سچے اخلاص کی خوشبو ملتی ہے اور یہ وہ شئے ہے جو اقبالؔ کے الفاظ میں جنت میں بھی نہیں ملتی ۔ آپ کی

تحریروں کے بارے میں چند برس قبل جو رائے ظاہر کی تھی (اور جس کا آپ ازراہِ تواضع بار بار ذکر کرتے ہیں) مجھے مسرت ہے کہ وہ زمانے نے خاطر خواہ حد تک درست ثابت کی ہے۔ تب سے آپ کی سینکڑوں اور تحریریں پڑھ چکا ہوں اور مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ کشمیر میں اس صنف خاص کے ایک ممتاز مکتب فی الذات بن گئے ہیں۔ آپ کی تحریر کا خوبصورت اسلوب، اس کی فصاحت، بے پناہ سلاست اور اس کی دل لبھانے والی سبک سبک روانی۔ یہ واقعی ایک مشاق ادیب کا خاصہ لگتے ہیں۔ ہمارے یہاں عبارت آرائی کرنے والے تو بہت ملیں گے مگر صاف، سیدھی، شستہ، شریف اور نوک پلک سے درست اُردو لکھنے والے خال ہیں...... یاد رہے کہ آپ کے اسلوب کی داد دے رہا ہوں۔ جس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان کے متن اور مقصد کے بارے میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ لیکن خیالات و معاملات میں زاویۂ ہائے نظر کا مختلف ہونا آپ کی ادبی صلاحیتوں پر کوئی حرف نہیں لاتا۔ میں آپ کے ادبی وجود کا ہی شیفتہ و فریفتہ ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آنے والے دنوں میں آپ کے قلم کی جولانیاں اور زیادہ نمایاں ہوں گی اور آپ کے طبعی جوہر کی داد دینے والوں کا حلقۂ وسیع تر ہوتا جائے گا...... اکادمی انعام وغیرہ ضرور اس سفر کے پڑاؤ ہیں .... لیکن لوح و قلم کی پاکیزگی کو............ تاریکیوں سے ترک نہیں کیا جاسکتا۔ زمانہ آخر میں ایک ذوی العدل کی طرح اپنا فیصلہ سنا دیتا ہے۔

میری تحریریں کوئی بہت زیادہ نہیں ہیں۔ وہی چند حسینوں کے خطوط والی بات۔ 'چٹان' میں کبھی کبھار ایک آدھ مضمون چھپ جاتا ہے۔ پچھلے دنوں میری کشمیری تحریروں پر مشتمل ایک کتاب چھپی ہے۔ آپ اس کو پڑھنے کی رغبت رکھتے ہوں تو ارشاد کریں۔ میں بھجوا دوں گا۔

جب تک ملاقات کی کوئی سبیل نہیں نکلتی، قلم کی قیل و قال جاری رہے تو دل

کے بہت سے زخموں پر پھاہا لگتا رہے گا۔

نہ بادہ ہے، نہ صراحی، نہ جام و پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے، بزم جانانہ

رب العالمین آپ کو دین اور دنیا کی سعادتوں سے نوازے!

نیاز مند
محمد یوسف ٹینگ

* * *

مکتوب نمبر-5

(از جناب محمد یوسف ٹینگ صاحب)

T-3, Tulsi Bagh,
سرینگر۔
2/مئی 06ء

برادر محترم جناب مخلصؔ صاحب
السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

مجھے سرینگر آئے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے۔ کشمیر بیمار ہے اور یہاں آتے ہوئے اس بیماری کے آثار وعواقب نے مجھے بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ لیکن کل آپ کا خوبصورت اخلاص نامہ مل کر بہت اچھا لگا ؎

جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

آپ جیسے اہل دل اب کہاں ملتے ہیں؟ کشمیر سے دور رہ کر اگرچہ آپ کے گُہر پاروں کو دیکھنے کی فرحت کم ملتی ہے لیکن اللہ کا کرم ہے کہ دیر سویر ہی سہی، میں

آپ کے کالم دیکھنے کی لذت حاصل کرتا رہتا ہوں۔ آپ یقین کریں کہ مجھے ان کا انتظار بھی رہتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کالموں کا اختصار ایجاز کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔ زبان کا سڈول پن اور مفہوم کی بلاغت...... جیسے بلّور کے گلاس میں شرابِ طہور کی چھنک اور اُس کے اوپر عود وعنبر کے بادل منڈلاتے ہوئے۔ آپ جتنے وسیع مضامین اور موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں اور پھر ایک مختصر سے کالم میں اُن کی جزئیات اور اسرار ورموز کا عطر پیش کرتے ہیں، وہ قابل داد ہے۔ میری کوتاہ علمی کے حساب سے کشمیر میں کسی نے آج تک اس طرح کا کالم یہاں اتنے تواتر اور اتنی ہمہ گیری سے نہیں لکھا اور یہ نئی روایت ہم سب کا سر اونچا کرتی ہے۔

مخلصِ من! یہ آپ کیا سوچتے ہیں کہ میں نے پہلے آپ کو "حوصلہ افزائی" کا خط لکھ کر کوئی احسان کیا۔ بالکل نہیں۔ جب میں نے آپ کی کتاب پڑھی تو مجھے اس کے لکھنے والے کے قلم کی روشنی کا خوب اندازہ ہوگیا تھا۔ اگر آپ کی تحریر مجھے خوشبو کی لپیٹوں کی طرح اپنی جادوئی جکڑ میں نہ لیتی، تو میں ہرگز اپنی پسندیدگی کا والہانہ اظہار نہیں کرتا...... ہم بے نوا قلم اُٹھانے والوں کو اپنی تحریر کی صداقت اور سچائی کو نبھانا نہ آئے۔ تو ہم واقعی اس مقدس شئے کو اُٹھانے کے حقدار نہیں، جس کی صریر کے ساتھ الہام کے زمزمے اپنی آواز شامل کرتے ہیں۔ مجھے آپ کے جسمانی اور ذہنی آشوب کا پورا اندازہ ہے اور اپنی خلوتوں میں ان کی چبھن محسوس کرتا رہتا ہوں۔ لیکن آپ کے ساتھ شرافت اور فصاحت کے جو دھارے چلتے ہیں، اُن کے پیش نظر ایسا ہونا فطرت کے شتر غمزوں کے ساتھ ہم آہنگ لگتا ہے۔ فطرت جو اپنے جودت پسند اور برکت پناہ بندوں کو نیزوں پر بٹھائے رکھتی ہے۔ زیادہ لکھنے سے بہت نازک مفروضوں کے آبگینوں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

سرینگر میں اس سال میری Land Line کام نہیں کررہی ہے۔ میرا

موبائل نمبر ....۔ کبھی کرم کا مزاج ہو تو بات کیجئے ...... مگر قلمی خط و کتابت کی سخاوت پر میرا اصرار ہے ع

با کریماں ایں ہمہ دشوار نیست

آپ کی صحت مند طوالت عمر اور باثمر قلم برداری کا طالب
محمد یوسف ٹینگ

⁂

مکتوب نمبر-6

(از جناب عبدالجبار جوہر)
معرفت روزنامہ ''قومی آواز''
جموں.

محترمی برادر مخلص صاحب دامہ اقبالہ
تسلیم وآداب!

خیریت طرفین سپردم بخدائے عزوجل: آپ کی تصنیف کردہ کتاب ''دعوتِ فکر'' نظر نواز ہوئی۔ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے جہاں یہ محسوس ہوا کہ ہر مضمون کا عنوان جداگانہ ہے، وہاں ظاہری ومعنوی اعتبار سے ساحر لدھیانوی کے اس شعر کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے جس کو آپ نے کتاب کے پیش لفظ میں تحریر فرمایا ہے۔ واقعی کتاب کا اسلوبِ تحریر بڑا جاندار اور انشائیہ کے انداز میں آپ کے تجربات اور علمی تبحر کا عکاس بھی ہے۔ کتاب نام کے اعتبار سے بالکل اسم بامسمیٰ لگتی ہے اور قاری کو غیر محسوس طریقے سے زندگی کے مختلف رنگ

دکھا کر دعوتِ غور و فکر دیتی ہے۔ ہر چند کہ آپ کشمیری نژاد ہیں لیکن اُردو پر آپ کی گرفت بجا طور پر کشمیری دانشوروں کے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔ آپ کی کتاب کے مختلف العنوان مضامین کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے، وہ آپ کی فنی صلاحیتوں کی غماز ہے۔ جس پر آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ کتاب ''دعوتِ فکر'' بالخصوص کشمیر اور بالعموم برصغیر کے ادبی حلقوں میں واقعی ایک منفرد مقام کی حامل ہے۔ جہاں تک کتاب کے مواد کا تعلق ہے، اس سے مجھے دو پہلو اُجاگر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جو آپ کو بحیثیت مصنف کے حاصل ہوگا، دوسرے اس کے پس منظر میں جو کچھ قاری حاصل کر سکتا ہے۔ اس کو میں آپ کی طرف سے صدقۂ جاریہ کے طور پر لوں گا۔

کتاب متذکرہ کا اگرچہ ہر عنوان اپنے نفس مضمون کے لحاظ سے برمحل اور برجستہ ہے، تاہم اس کے دو عنوان ''زیرکی'' اور ''توشہ'' نے مجھے نہ صرف مسرور و محظوظ کیا بلکہ بے ساختہ ہنسی کا فوّارہ بھی پھوٹ پڑا...... حرف ''ب'' پر نقطوں کی تقسیم اور توشہ کے آمیزہ کی مقدار نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ جس طرح علامہ مودودیؒ کی ہر تحریر کے ساتھ تحقیقی عناصر شامل ہوتے ہیں، آپ کی تحریر میں بلاشبہ وہی انداز بدرجہ اتم موجود ہے۔ کتاب کا فنّی پہلو اس اسلوب کو نمایاں کرتا ہے جو آپ نے اختیار کیا ہے۔ طنز و مزاح اور تیر و نشتر کے انداز میں پیش کئے گئے مضامین کو اگرچہ آپ نے انشائیہ قرار دیا ہے لیکن جو کچھ آپ نے پیش کیا ہے، اس میں قاری کے لئے ضرور ایک پیغام پنہاں ہے جس کو آپ نے بڑی خوبصورتی سے قاری تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

کتاب کو مجلد دیکھ کر مجھے اپنے بچپن کے وہ بھولے بسر وعدے یاد آئے جب ہم اکثر بار اپنی محفلوں میں گاؤں کو چار چاند لگانے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ میں اگرچہ سیاست کی صحرانوردی میں خاک چھانتا رہا لیکن آپ کی کتاب

دیکھ کر مجھے لگا کہ ہمارے بچپن والے خوابوں کے ارمان آپ نے پورے کر لئے ۔ آپ صاحبِ کتاب بن کر واقعی نہ صرف علاقہ سیر جاگیر کے نام کو روشن کرنے والے ایک تابناک ستارے کی مانند نمور ہو گئے بلکہ کشمیر کے ادبی حلقوں میں ایک لازوال حیثیت کے مالک بھی بن گئے ہیں...... آپ کی کتاب پر تبصرۂ بے باک اور بے لاگ کر کے جو کچھ قلم کی نوک پر آیا، لکھ دیا۔ میں نہ تو عالم و فاضل ہوں اور نہ ہی نقاد ہوں بلکہ جو کچھ لکھ دیا، خلوص کی بنیاد پر لکھ دیا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس تبصرے کو حق دوستی کے سوا کچھ اہمیت نہ دیں گے۔ میں اب اس امید کے ساتھ خط کو تمام کرتا ہوں کہ آپ فرصت کے کچھ لمحات نکال کر میرے غریب خانے پر تشریف فرما ہو کر ممنون کریں گے۔

خیر اندیش
غریب الدیار
عبدالجبار جوہر

(جوہر صاحب میرے بچپن کے ساتھی ہیں اور وادی میں حالات کے تغیر کی وجہ سے جموں میں مقیم ہیں)

⁂

مکتوب نمبر-7

(از جناب منظور انجم صاحب)
چیف ایڈیٹر روزنامہ "عقاب"
سرینگر

محترم المقام مخلص صاحب
السلام علیکم

آپ کی تمام شکایتیں بالکل درست ہیں۔ مجھے اس کا پہلے ہی احساس ہے اور افسوس بھی ہے لیکن کبھی کبھی انسان حالات کے ہاتھوں اتنا مجبور ہوتا ہے کہ چاہنے کے باوجود بھی کچھ نہیں کر پاتا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جو کاتب "دعوتِ فکر" کا کالم لکھتا ہے، وہ کسی کام سے دہلی گیا ہے۔ عارضی طور پر یہ کالم دوسرے کے سپرد کر گیا۔ میں دوسرا انتظام نہیں کر سکتا کیونکہ اُسے واپس آنا ہے۔ اسلئے چند روز تک جبراً وقہراً ہمیں اس قیامت کو سہنا ہی پڑے گا۔ میں آپ کے کالم کا انتظار عید کے چاند کی طرح کرتا ہوں اور بے شمار لوگ اس کالم کو بہت پسند کرتے ہیں۔

آپ کا اپنا
منظور انجم

مکتوب نمبر-8

(از جناب منظور انجم صاحب)

چیف ایڈیٹر روزنامہ ''عقاب''

سرینگر

29 جنوری 99ء

محترم مخلص صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ یہ چند سطور بوجھل دل اور مایوس جذبات کے ساتھ لکھ رہا ہوں۔ آپ کا کالم ''دعوتِ فکر'' ''عقاب'' کی جان بن چکا ہے اور آپ نے نامعلوم وجوہات کی بناء پر اس معصوم کی جان نکال لی۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کو ظالم کہوں لیکن اس ذرخیز دماغ اور اُس جاندار قلم کی محبت روکتی ہے جو آپ نے پایا ہے۔ میں نے کافی انتظار کیا۔ امید تھی کہ آج نہیں تو کل ''دعوتِ فکر'' لے کر کوئی ڈاکیہ آجائے گا لیکن اُمیدوں کی ساری شمعیں گل ہوگئیں۔ ضبط کا باندھ ٹوٹ

گیا تو سوچا کہ آپ کو کھری سنا کر اپنا بوجھ ہلکا کروں۔ میرا بوجھ تو ہلکا ہو گیا لیکن آپ خدا کو کیا جواب دیں گے۔ جب وہ پوچھے گا کہ آپ نے ''دعوتِ فکر'' دینا کیوں بند کر دیا۔

آپ کی صحت اب کیسی ہے؟ ''دعوتِ فکر'' نہ سہی اپنی صحت ہی کی خبر دیا کیجیے۔ ہمیں کافی فکر لگی رہتی ہے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے اور یہ توفیق دے کہ آپ ہماری رہبری کرتے رہیں۔ آپ سے کافی کچھ سیکھنے کو ملا ہے۔ اس کی جزا اللہ آپ کو ضرور دے گا۔

والسلام
خلوص کیش
منظور انجم

⁂

مکتوب نمبر-9

(از جناب حکیم منظور صاحب)
چیف ایڈیٹر ''خبر و نظر'' ویکلی
سرینگر

میرے کرم فرما مخلص صاحب۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ'

میں 19 دسمبر 1999ء سے اپنے فرزند کے پاس آیا ہوں۔ انشا اللہ اگلے چند روز میں سرینگر لوٹ جاؤں گا۔ آپ کا 21 فروری کا گرامی نامہ مجھے یہاں (ہریانہ میں) کل ہی redirect ہو کے ملا۔

آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ حرف بہ حرف درست ہے۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو شاید میرا لہجہ زیادہ ناخوشگوار ہوتا۔ سچ یہی ہے کہ آپ کے تینوں مضامین مجھے ملے اور میں نے انہیں متعلقہ فائل میں تین مختلف شماروں کے مواد کے ساتھ رکھا۔ آپ مجھ پر نہیں میرے خدا پر یقین کریں کہ شمارے پر شمارہ ملتا رہا اور میں حیران ہوتا رہا کہ آپ کا کوئی مضمون دیکھنے کو کیوں نہیں ملتا۔ ایک نہیں کئی بار صرف اس معاملے کے حوالے سے سرینگر ٹیلی فون کیا اور ہر بار جواب ملا ''ڈھونڈ رہے ہیں

۔ ”میرے دفتر والوں یا کاتب کی تلاش سعیٔ نامشکور ہو کر رہ گئی ہے اور ذاتی حیثیت میں میری شرمندگی کا باعث۔ صاف ظاہر ہے کہ آپ کے مضامین کے ساتھ اور بھی بہت سا مواد کہیں گم کر دیا گیا ہے۔ میں غیر مشروط طور پر معذرت اور معافی مانگنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔ شاید اصولی طور پر میرا اتنا حق بھی نہیں بنتا۔

آپ کے لئے واقعی یہ کوئی اہم بات نہیں کہ آپ ”خبر و نظر“ میں چھپتے ہیں یا نہیں مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ”خبر و نظر“ آپ کے شذرات کا محتاج ہے۔ نہ اس میں تملق ہے اور نہ کاروباری ادا۔ یہ میری پُرخلوص رائے ہے۔ ارے صاحب! اب لوگ ہی کہتے ہیں جو زبان و بیان پر آپ جیسا عبور رکھتے ہیں اور بغیر کسی معاوضے کے اپنے خونِ جگر سے صفحۂ قرطاس کو گویا کرتے ہیں۔ میں کیسے آپ کو یقین دلاؤں کہ میں تہہ دل سے آپ کی عزت کرتا ہوں اور میں آپ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ آپ کی تو بات ہی نہیں، کسی کے پاس بھی وقت ضائع کرنے کے لئے نہیں ہوتا۔ (ہونا بھی نہیں چاہئے) اور جو وقت میری وجہ سے آپ کا ضائع ہوا، میں دست بستہ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

آپ نے ”کارِ لائقہ سے یاد فرمانے“ کی بات کہی ہے۔ سو کارِ لائقہ یہی ہے کہ آپ ہمارا معافی نامہ قبول کریں اور اپنے مضامین کی نقل ہمیں عنایت فرمائیں اور ہم سے روٹھیں نہیں۔ جب تک آپ کے مضامین نہیں آتے (جو آپ کسی کے ہاتھ 20 مارچ کے بعد کسی بھی دن بھجوا سکتے ہیں۔) میں مضطرب رہوں گا اور سمجھوں گا کہ آپ نے معاف نہیں کیا ہے۔

اللہ آپ اور آپ کے متعلقین پر اپنی رحمتیں ارزاں فرمائے۔

والسلام علیک
آپ کا اپنا

حکیم منظور

7/3/2000
(جناب)حکیم منظورؔ:
Former Deputy Commissioner/Collector
President: Editors and Writers Council
Chief Editor: "Khabr-o-Nazar"
10- Prtap Park
(Press Enclave)
Srinagar, 190001

* * *

مکتوب نمبر-10

(از جناب ڈاکٹر بشیر احمد نحوی صاحب)
ڈائریکٹر اقبال انسٹی چیوٹ
یونیورسٹی آف کشمیر، سرینگر

26.5.2000

باسمہٖ
برادرِ مکرم مخلص صاحب
السلام علیکم ورحمتہ اللہ

15 رمئی کا آپ کا تحریر کردہ عنایت نامہ ملا۔ آپ کی دلنواز شخصیت اور کوثر وتسنیم کی موجوں میں ڈھلی ہوئی خوشنما تحاریر میرے لئے باعث طمانیت وہمت ثابت ہورہی ہے۔ آپ کے ایک نوازشنامے کے جواب میں بیک وقت تین ''دعوت نامے'' ارسالِ خدمت کرر ہاہوں۔ ایک اور استدعا ہے کہ ''دعوتِ فکر'' کی تین کاپیاں مع بِل اقبال انسٹی چیوٹ کی سیمینار لائبرریری کے لئے مرحمت فرما کر شکریہ کا موقع دیجئے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے اور اس علّت (جوڑوں کے

لائبریری

درد) کو دور کر کے، جو آپ کے ذہنی و علمی مشاغل کو متاثر کئے ہوئے ہے۔ انٹرنیٹ کے دور میں اب بھی ہمارا ٹیلی فون نظام عہد پاستاں کی داستان بیان کرر ہا ہے۔ لہٰذا "Wrong Number" کی آواز سنائی دینا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میری معمولی سی ادبی سرگرمیوں کو کوئی ناپسند کرے یا اس سے خار کھائے، اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ فی الحقیقت ہر معاشرے کی فطرت میں شامل ہے۔ امام غزالیؒ کا قول ہے :

"محسود بودن سعادت است"

7 جون کی صبح کو چشم براہ رہوں گا۔

آپ کا
نحوی

⌘

مکتوب نمبر-11

(از جناب شہباز راجوروی صاحب)

بہروٹ، تھنہ منڈی

5/ذوی الحجہ 1426ھ

گرامی قدر مخلص صاحب

تحیات و نیاز   عید سعید کی تبریکات۔ مزاج معلّٰی

میرے چند سطور پر مشتمل خط کا جواب آپ کی بلند اخلاقی اور شفقت ہے۔ آپ جس اندوہناک تجربے سے گزرے تھے، وہ معمولی نہیں۔ جہاں ”دیدۂ یعقوبؑ“ وقتی ہجراں اور جدائی میں وفورِ اشکباری سے ”روزنِ دیوارِ زندان“ ہو گئیں۔ وہاں صبحِ یوم النشور تک غمِ فراق میں غمگساری کہاں ممکن!

بہر حال! یہ آپ کی ایمانِ کامل اور الوالعزمانہ صبر کی براہیمؑ جیسی ابتلا تھی۔

اولوالعزمانہ

حق تعالیٰ ہاجر و مہجور کے درجاتِ رفیع ارزاں فرمائے۔

آپ کی تحریریں باصرہ نواز ہوتی رہیں۔ یہ دردمندی اور اخلاقیات سے قوام اس عہد میں کسی سعدیؒ کے حساس اور خیر خواہ فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ آپ کی تیز بین نگاہیں پسِ پردہ حقیقتوں کا ادراک اور تشریح کا ملکہ رکھتی ہیں۔ ہمارے ریاکارانہ اور نمائشوں پر تعمیر معاشرے میں اس تناظر میں بہت کم لوگ سوچتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں۔ پھر ان محسوسات کو آپ کی جیسی قدرتِ بیان کے ساتھ پیش کرنا خال خال ہی میسر ہے۔ ''ایں سعادت..........''

مجھ بے ہنر کا شعر پسند فرمانا اور حوالتاً خود گنگنانے کا اقرار۔ آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔ اس ناسزا حوالی میں قابل ذکر روایت نہیں۔ ادبی و علمی داشت نہیں۔ ستھرے اور نکھرے تعمیری، فکری رویے نہیں۔ وہاں شعر گوئی صرف اپنی ذات کو سرمدؒ کے محاورہ میں ''تہہ سنگ'' رکھ کر ایک جذبے کو پوشش الفاظ دیتا ہے۔ نہ معلوم اس بازئ الفاظ میں کوئی سلیقہ بھی ہے یا نہیں۔ لفظی لباس کی موزونیت، رنگ، دل کشی اور حسن افزائی کا دماغ کہاں۔ یوں ہی لکھے جارہے ہیں۔

میرا کشمیری مجموعہ پچھلے سال شائع ہوا تھا۔ ''طواف''۔ اس پر محترم رحمان راہیؔ، ڈاکٹر مرغوب بانہالی اور محمد یوسف ٹینگ نے اپنے بیش قیمت پیش لفظ لکھے تھے۔ محترم شاد رمضان صاحب نے 2 اکتوبر 2005ء کو D.D.Srinagar سے بحث فرمائی تھی۔ (12 بجے دن)۔ جناب مجروحؔ رشید نے 19 اکتوبر 2005ء (شب دس بجے) ریڈیو سرینگر سے تبصرہ فرمایا تھا۔ ہم اُسی وادئ جنت نشان سے نکالے گئے یا نکلے ہوئے ہیں۔ 7 صدی قبل، شوپیاں کے ملحق گاؤں سعد پورہ سے۔ نہ معلوم یہ جنوں، کہ اب بھی ٹکسالی کشمیری بولوں یا لکھوں، کیوں، نہ معلوم خود فریبی ہے۔ البتہ وادی کے رسائل و جرائد قبولتے رہتے اور مجھے حوصلہ ملتا رہا۔ خیر یہ ثنائے خود واجب نہیں۔ اعتذار!

آپ سے ملاقات کا اشتیاق! سوچتا ہوں براستہ جموں تقریباً سوپور تک 700 کلومیٹر کی مسافت۔ رب کائنات کوئی سبیل ایجاد فرمائے۔ میں اس دیدِ سعید سے نہال ہوتا۔ دعاؤں میں شامل رکھئے۔ والسلام

نیاز کیش

شاہباز راجوروی

* * *

مکتوب-12

(جناب رفیق رازؔ صاحب)
ڈائریکٹر ریڈیو کشمیر، سرینگر

برادرِ محترم جناب مخلصؔ صاحب
السلام علیکم

اُمید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

برادر شفیقؔ صاحب کی وساطت سے آپ کی کتاب اور اخبارات موصول ہوئے۔ ماشاء اللہ! کتاب پر کیا تبصرہ کروں۔ میرے خیال میں ہمارے معاشرے میں آپ کو خدا نے بہت زیادہ سماجی شعور اور دینی فہم سے نوازا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ آپ کا اسلوب بیان بے حد متاثر کن اور امتیازی ہے۔ کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ بہت جلد ہی کتاب پر تبصرہ بھی لکھوں گا۔

آپ نے ''احتساب'' میں میری کشمیری شاعری کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کے لئے میں بے حد ممنون ہوں۔ سماجی شعور اور دینی فہم کے علاوہ آپ ادبی شعور اور تنقیدی مزاج بھی رکھتے ہیں۔ اخبارات کی فائل

جلد ہی واپس کر رہا ہوں۔

کبھی ریڈیو پر تشریف لا کر ہمیں بھی شرفِ دیدار بخشیں۔

آپ کا مخلص
رفیق راز
ریڈیو کشمیر، سرینگر

(۱)- یہ خیالات بعد میں کتابی صورت میں شائع ہو گئے ہیں اور کتاب کا نام ہے ''سُر شہنائی کے''۔ جو راز صاحب کے شعری مجموعے ''نے چھے نالان'' کا مطالعاتی جائزہ ہے۔

⁂

مکتوب-13

(از جناب رحمان قدوسؔ صاحب)
۲۲۲ر محلّہ خیلدار
شہر فتح پور، یو پی

27.3.2002

باسمہٖ تعالیٰ

مکرمی و محترمی جناب رحمان صاحب

سلام مسنون

''قصہ ٔ چہار درویش'' بے حد پسند آیا۔ (عالمی ماہنامہ ''انشاء کلکتہ میں شائع شدہ) مبارکباد قبول فرمائیں۔

کہانی لکھنے کی فنکارانہ صلاحیت، ماشاء اللہ، بہت ہی نایاب ہے۔ اندازِ تحریر دلچسپ۔ التجا ہے پھر ایسی ہی کوئی دلچسپ کہانی اسی پرچے میں آنے والے شمارے میں شائع کر کے شکریہ کا موقعہ عنایت فرمائیں۔

اُمید کہ معہ اہل و عیال بعافیت ہوں۔ زیادہ کیا لکھوں۔

احقر العباد
رحمٰن قدوسؔ

* * *

مکتوب-14

(از جناب جی ایم شاہ صاحب)
سابق چیف منسٹر ریاست جموں وکشمیر

18/جولائی 2003ء

مکرمی عبدالرحمان صاحب مخلصؔ دام اقبالہٗ

دعا وسلام منسون

16 جولائی 9 بجے اپنے خادم نے کہا کہ کوئی صاحب کتابیں لے کر آیا ہے۔ بہت مصروف تھا مگر جھٹ نیچے آ گیا اُن کو ملنے کے لئے۔ انہوں نے اپنا نام تو بتایا مگر یاد نہ رہا۔ علیک سلیک کے بعد آپ کا تعارف کرایا اور تین کتابیں مرحمت کیں۔ شکریہ کے ساتھ یہ گراں قدر تحفہ لیا۔ اُن سے التماس کی کہ کسی اتوار کو دن کے گیارہ بجے کے بعد آ کر اپنی باتوں سے محظوظ کیجئے۔ اِس وقت مصروف ہوں میرا شکریہ جناب مخلصؔ صاحب تک پہنچا دیجئے۔ انہوں نے کہا کہ صفحہ نمبر 212 پڑھئے۔ پڑھا اُن کے سامنے اور پھر تین بار ان کے بعد۔

واہ حضرات! کیا ذرّہ نوازی ہے۔ ایک بڑا حقیر آدمی، ازلی گنہگار..... کیسے

''عظیم انسان'' بنا۔ کاش یہ لقب آپ مجھ کو نہ دیتے اور جو لقب متکبر بنا سکتا ہے۔ جس کام کے لئے آپ نے لقب مجھ پر تھوپ دیا ہے، وہ میرا فریضہ تھا کہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ اپنا فریضہ ادا کیا۔ پس اس میں عظمت کہاں سے ٹپکی۔ یہ بات تحریر میں آکر اُلٹ بنی۔ خدا تعالیٰ آپ اور مجھ پر رحم کرے۔ آپ نے مجھے وہ بنادیا جو میں نہیں ہوں۔

''زندگی کے رنگ'' کو پڑھنے لگا ہوں۔ مختلف کرداروں کے متعلق آپ نے لکھا ہے۔ جس طرح شیکسپیئر اور مولانا آزاد لکھا کرتے تھے۔ پڑھ کر بہت محظوظ ہوا۔ اُمید ہے کہ تمام عاشقانِ علم آپ سے انسانوں کی نقاشی جان کر آپ کی حیرت انگیز تعلیم سے بہرہ مند ہوں گے۔

کتابیں ختم کر کے پھر لکھوں گا۔ تب تک والسلام

دعا گو

غلام محمد شاہ

حقیر آدمی

(ا)- صفحہ 212 ''زندگی کے رنگ'' پر جناب شاہ صاحب کے حوالے سے کالم ''عظیم انسان'' ملاحظہ ہو۔

* * *

مکتوب نمبر-15

(از جناب نور شاہ)
مسکن، لل دید کالونی
راولپورہ، سرینگر

محترمی!

میں باقاعدگی کے ساتھ عبدالرحمٰن مخلصؔ صاحب کا تحریر کردہ کالم ''زندگی کے رنگ'' پڑھتا ہوں اور پسند کرتا ہوں۔ اس عنوان سے اُن کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے اور یہ مجموعہ ادبی چاشنی سے مالا مال ہے۔ رفیق رازؔ صاحب پر اُن کی تخلیق ''سر شہنائی کے'' اہمیت کی حامل ہے۔ انہوں نے رفیق رازؔ کی ادبی شخصیت کو ''نَے چھ نالاں'' کے پس منظر میں خوب اُبھارا ہے۔ ان کے افسانے بھی کبھار کبھار پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ حال ہی میں اُن کا افسانہ ''شکست آرزو'' ماہنامہ ''انشاء'' کلکتہ میں شائع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے کشمیر کے موجودہ دور کی عکاسی ایک نئے انداز سے کی ہے۔ مخلصؔ صاحب کے ہاں تجربات، مشاہدات اور

موضوعات کا ایک وسیع کینواس ہے جس پر مختلف رنگ بکھرے نظر آتے ہیں اور یہ رنگ نہ صرف آنکھوں کو اچھے لگتے ہیں بلکہ ذہن کی نئی راہیں کھولنے میں مدد دیتے ہیں۔ وہ زبان وبیان کی نزاکتوں سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی صحت یابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔

شائع شدہ:

ہفت روزہ ‘‘احتساب’’ سرینگر

16 مارچ تا 22 مارچ 2009ء

◆

’’دعوتِ فکر‘‘ پر تبصرہ

ماہنامہ ’’اُردو دُنیا‘‘ نئی دہلی
اکتوبر، 2000ء
مدیر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ صاحب

’’دعوتِ فکر‘‘
مصنف: عبدالرحمٰن مخلصؔ
ڈیمائی
صفحات: 428، قیمت: 300 روپے
ناشر: عبدالرحمٰن مخلصؔ، سیر جاگیر، سوپور، کشمیر۔ 193201

یہ کتاب جناب عبدالرحمٰن مخلصؔ کے 116 مختصر مضامین کا مجموعہ ہے جو مصنف کے طویل غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ انہیں کتابی صورت میں منظر عام پر لانے کا مقصد انہوں نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے: ’’انہیں پیش کرنے کی میری پہلی اور

آخری غرض یہ ہے کہ یہ کسی نہ طرح بنی نوع انسان کے لئے باعثِ ہدایت اور میرے لئے دنیا و آخرت میں وسیلۂ نجات بن جائیں اور میں ترسیل خیر کی اُس ذمے داری سے کسی حد تک بری الذمہ ہو جاؤں جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اُس شخص پر ڈال دی ہے جسے کسی کلمۂ خیر کا علم ہو اور وہ اسے دوسروں تک پہنچانے کی اہلیت واستطاعت رکھتا ہو"۔

کتاب میں شامل سبھی مضامین وقتاً فوقتاً کشمیر کے مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور ہم عصر زندگی کے ان سبھی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں، جن سے آج ہم دوچار ہیں۔ کتاب سنجیدہ مطالعے کا تقاضا کرتی ہے۔

◆

''زندگی کے رنگ'' پر تبصرہ

ماہنامہ ''انشاء'' کلکتہ

مدیر: ف۔ س۔ اعجاز

ہندوستان کا ممتاز بین الاقوامی اُردو رسالہ

جولائی، اگست، 2003ء

نام کتاب: زندگی کے رنگ
مصنف : عبدالرحمٰن مخلصؔ
قیمت : دوسو پچاس روپے
ملنے کا پتہ : عبدالرحمٰن مخلصؔ، سیر جاگیر، سوپور 193201
(جموں کشمیر)

''زندگی کے رنگ'' ہفت روزہ ''احتساب'' (سرینگر) میں چھپنے والے ایک سو پندرہ کالموں کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ایک سو سالہ مضامین پر مشتمل ان کا مجموعہ ''دعوتِ فکر'' کے عنوان سے شائع ہو کر خاطر خواہ مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ دونوں کتابوں کی غرض وغایت اصلاح اُمتِ مسلمہ بالخصوص اور بالعموم پورا انسانی

مصنف کی دوسری کتابیں

۱. ’سنگدل باپ‘ (ناول) 1960ء

۲. ’بہتر زندگی‘ (حصہ اول و دوم)

معاونت برائے سٹیٹ ریسورس سنٹر یونیورسٹی آف کشمیر

۳. ’دعوت فکر‘ مضامین کالم 2000ء

۴. ’سُر شہنائی کے‘ رفیق راز کی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ انعام یافتہ کتاب ’’نے چھے نالاں‘‘ کا ایک مطالعاتی جائزہ

۵. ’سخن ہائے گفتنی‘ زیر طبع (مقالے۔ مضامین۔ جائزے)

۶. ’سات آسمان ایک زمین‘ (اپنے سات اساتذہ کرام کے خاکے)

ہفت روزہ ’احتساب‘ میں شائع شدہ

۷. ’زندگی کے رنگ‘ (مضامین، کالم، افسانے، انشایئے)

۸. ’امید بہار‘ (مضامین، کالم، افسانے، انشایئے)

(کالم ’زندگی کے رنگ‘ کا کتابی سلسلہ ۳)

۹. ’انتظارِ بہار‘ (مضامین، کالم، افسانے، انشایئے) زیر ترتیب

(کالم ’زندگی کے رنگ‘ کا کتابی سلسلہ ۴)

PURWAI

Ab. Rahman Mukhlis

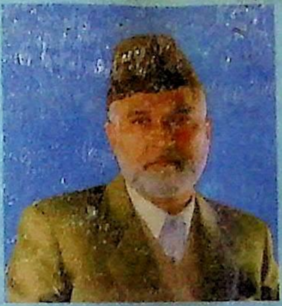

مصنف کی دوسری کتابیں:-

۱۔ ''سنگدل باپ'': ناول ۱۹۶۰ء

۲۔ ''بہتر زندگی'' حصہ اول و دوم

معاونت برائے سٹیٹ ریسورس سینٹر یونیورسٹی آف کشمیر

۳۔ ''دعوت فکر'' مضامین کالم ۲۰۰۰ء

۴۔ ''سر شہنائی کے'' رفیق راز کی کتاب 'نے چھے نالان' کا

ایک مطالعاتی جائزہ ۲۰۰۱ء

Meezan Publishers
Opp. Fire & Emergency Services H/QRS, Batamaloo, Srinagar 190009 Kashmir
Ph: 2470851 Fax 0194-2457215 Cell 9419002212
Email: meezanpublishers@gmail.com / meezanpublishers@rediffmail.com
ISBN 978-93-80691-41-
978-93-80691-41-1